الرسالہ

سرپرست
مولانا وحیدالدین خاں

کوئی بڑا کام صرف وہ شخص کرتا ہے جو
اپنے آپ کو چھوٹا کام کرنے پر راضی کرلے

دسمبر ۱۹۸۴ء

شمارہ ۹۷

تذکیر القرآن

جلد اوّل

سورۂ فاتحہ ـ سورۂ توبہ

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی تفصیلات اور غیر متعلق معلومات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لئے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبین قرآن کے لئے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ھدیہ مجلّد: پچاس روپے

مکتبہ الرسالہ

سی - ۲۹ ، نظام الدین ویسٹ ، نئی دہلی ۱۳

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان
اُردو، انگریزی میں شائع ہوتا ہے

دسمبر ۱۹۸۴ء □ شمارہ ۹۷

زرِ تعاون سالانہ	۳۶ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	دو سو روپے
بیرونی ممالک سے :	
ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

الرسالہ کے لئے بنک سے رقم بھیجتے ہوئے
ڈرافٹ پر صرف الرسالہ متصلاً
'AL-RISALA MONTHLY' لکھیں۔

ماہنامہ الرسالہ
سی - ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گھاٹے والا

قرآن میں ارشاد ہوا ہے ـــــــ کہو، کیا میں بتاؤں کہ اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ گھاٹے میں کون لوگ ہیں۔ وہ لوگ جن کی کوششیں دنیا کی زندگی میں کھوئی گئیں۔ اور وہ اسی خیال میں رہے کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی نشانیوں کا اور اس سے ملاقات کا انکار کیا۔ پس ان کے اعمال ضائع ہوگئے۔ ہم قیامت کے دن ان کے اعمال کا کچھ وزن قائم نہ کریں گے (الکہف)

تمام محرومیوں میں سب سے زیادہ عجیب محرومی وہ ہے جب کہ آدمی کمائی کرے مگر اس کو اس کا حاصل نہ ملے۔ وہ مہینہ بھر محنت کرے مگر وہ کوئی تنخواہ نہ پائے۔ وہ تجارت میں اپنی ساری پونجی لگائے مگر اسے کچھ نفع حاصل نہ ہو۔ وہ ارمانوں کے ساتھ اپنا گھر بنائے مگر اس میں اس کو چین کے ساتھ رہنا نصیب نہ ہو۔

اگر کسی آدمی کے ساتھ ایسا حادثہ گزرے تو وہ بالکل بجھ کر رہ جاتا ہے۔ اس کے اعضاء شل ہوجاتے ہیں۔ اپنی محنت کے آخری نتیجے کو اپنی آنکھوں کے سامنے برباد ہوتے دیکھنا اتنا بڑا حادثہ ہے جس کو کوئی بھی شخص برداشت نہیں کر سکتا۔

یہ دنیا میں اعمال کی بربادی کا حال ہے۔ پھر آخرت میں جب آدمی اپنے اعمال کو ابدی طور پر برباد ہوتے ہوئے دیکھے گا تو اس کا کیا حال ہوگا۔

جب وہ دیکھے گا کہ عمر بھر کی محنت سے بنایا ہوا اس کا ڈھانچہ اچانک ڈھ پڑا۔ اس کی خوش گمانیوں کا قلعہ ایک ہی جھٹکے میں ہمیشہ کے لئے مسمار ہوگیا۔

جب وہ دیکھے گا کہ دنیا میں محنت کے ساتھ حاصل کی ہوئی کمائی آخرت میں اپنا کوئی وجود نہیں رکھتی دنیا میں کھڑا کیا جانے والا عظمتوں کا گنبد آخرت میں گرا ہوا پڑا ہے۔ دنیا میں جمع کی ہوئی نیک نامی آخرت میں بالکل بے قیمت ہو چکی ہے۔

جس آدمی نے اپنی دوڑ دھوپ کو صرف دنیا میں لگایا ہو اس کا آخرت میں یہی حال ہوگا کہ وہاں وہ بالکل مفلس بن کر کھڑا ہوگا۔ وہاں اس کی حیثیت صرف ایک لٹے پٹے انسان کی ہوگی۔ یہ منظر آدمی کیلئے ناقابل برداشت حد تک سخت ہوگا۔ کامیابیوں پر فخر کرنے والے ناکامی کے گڑھے میں گرے ہوئے ہوں گے۔ ترقیات پر ناز کرنے والے ایسے بدحال دکھائی دیں گے جیسے انہوں نے کبھی ترقی کا نام بھی نہیں سنا تھا۔

کام کا طریقہ

ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد شبلی نیشنل کالج (اعظم گڈھ) میں انگریزی کے استاد تھے۔ ۱۹۵۴ سے ۱۹۶۴ تک یہاں رہے۔ وہ کمیونسٹ تھے۔ ان کا معمول تھا کہ دن کو کالج میں انگریزی کی کلاس لیتے اور شام کے وقت شہر کے چوراہہ پر جاکر پارٹی کا اخبار بیچتے۔ وہ اخباروں کا بنڈل اپنے ہاتھ میں لے کر کھڑے ہوجاتے اور لوگوں سے کہتے "اس پارٹی کی سچائی میں کون شک کرسکتا ہے جس میں ایک پروفیسر سڑک پر کھڑا ہوکر اخبار بیچے"۔

دوسری مثال شیخ محمد سلیمان القائد کی ہے۔ وہ افریقہ کے ایک ملک میں دعوتی کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے دیکھا کہ وہاں بہت سے نوجوان ہیں جن کے اندر تبلیغ کا جذبہ ہے۔ مگر وہ غریب ہیں۔ انھوں نے ملک کے مختلف علاقوں سے کئی درجن نوجوان منتخب کئے۔ ان کے لئے ایک مختصر مشاہرہ مقرر کردیا اور ہر ایک کو ایک بائیسکل دے دی۔ یہ نوجوان بائیسکلوں پر گھوم گھوم کر تبلیغ کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس ملک میں پانچ سال (۸۴ - ۱۹۷۹) کی مدت میں تقریباً ۲۰ ہزار آدمیوں نے اسلام قبول کرلیا۔

قارئین الرسالہ سے ہم اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس کے تعمیری اور دعوتی مشن کو پھیلانے کے لئے اسی قسم کا تعاون فرمائیں۔ پہلی اور اعلیٰ صورت تو یہ ہے کہ آپ خود اپنی ذات کو اس عظیم کام میں لگائیں۔ آپ الرسالہ کی ایجنسی لیں۔ آپ اس کی مطبوعات منگا کر لوگوں تک پہنچائیں۔ آپ ہر اجتماعی موقع پر بک اسٹال لگا کر لوگوں کو اس مشن سے متعارف کرائیں۔ وغیرہ

لیکن اگر آپ کے پاس اپنی ذات کو اس مشن میں لگانے کے لئے وقت اور موقع نہ ہو تو دوسری صورت یہ ہے کہ بے روزگار، یا کم آمدنی والے لوگوں میں سے کسی کو تیار کریں۔ اس کو کچھ مشاہرہ دیں اور ایک بائیسکل دے کر اس سے کہیں کہ تمہارا کام یہ ہے کہ تم کتابوں کو پھیلاؤ اور الرسالہ کے خریدار بناؤ۔ وہ بستی بستی گھوم کر بس یہی کام کرتا رہے۔ یہ کام ایک فرد بھی کرسکتا ہے اور کئی لوگ مل کر بھی۔

اگر آپ الرسالہ کے مشن کو حق سمجھتے ہوں، اس کے باوجود اس کو پھیلانے میں آپ نہ براہ راست شرکت کریں اور نہ بالواسطہ، تو آپ کو سوچنا چاہئے کہ حقیقت کی نظر میں آپ اپنا نام کس خانہ میں لکھوا رہے ہیں۔

اژدہا بھی

اژدہا کا لفظ سنتے ہی ایک خطرناک جانور کا تصور سامنے آتا ہے۔ اژدہے کی بہت سی قسمیں ہیں۔ ہندستان کے جنگلوں میں اس خوفناک سانپ کی جو قسم پائی جاتی ہے اس کو ماہرین حیوانات مالورس اژدہا (Python molurus) کہتے ہیں۔ اس کی لمبائی ۲۰ فٹ ہوتی ہے اور وزن ۲۰۰ پونڈ سے زیادہ جب کہ وہ پورا ہو جائے۔

تاہم دوسرے وحشی جانوروں کی طرح اژدہا بھی کوئی خطرناک جانور نہیں۔ وہ کسی انسان یا کسی جاندار پر صرف دو حالتوں میں وار کرتا ہے ـــــ جب کہ وہ بہت بھوکا ہو، یا اس پر حملہ کیا جائے۔ عام حالات میں وہ بالکل بے ضرر جانور کی طرح پڑا رہتا ہے۔ ایک ماہر حیوانات نے اژدہے کے طویل مطالعہ کے بعد لکھا ہے:

اژدہا، خواہ کتنا ہی بڑا ہو، فطری طور پر وہ عصبی مزاج کا ہے۔ وہ دوسرے تمام سانپوں کی طرح کبھی بالقصد حملہ نہیں کرے گا۔ اور نہ کبھی وہ جارح بنے گا۔ الّا یہ کہ اسے مشتعل کر دیا جائے۔ اگر جنگل میں اس کا سامنا پیش آجائے تو وہ آواز نکال کر ڈرائے گا یا غائب ہو جائے گا مگر وہ نہ تو اٹھے گا اور نہ لڑائی کرے گا، جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے (ہندستان ٹائمس ۱۹ اکتوبر ۱۹۸۴)

اژدہے کے اندر یہ خصوصیت محض اتفاقاً نہیں، وہ براہ راست خالق کائنات کا منصوبہ ہے۔ اژدہا فطرت کی ایک خاموش پکار ہے۔ وہ عمل کی زبان میں انسان سے کہہ رہا ہے کہ ـــــ اگر تم اژدہا ہو تب بھی کسی کو نہ کاٹو۔ اگر تم زور اور قوت میں دوسروں سے بڑھ جاؤ تب بھی دوسروں کو نہ ستاؤ۔

کیسا عجیب ہے وہ انسان جو ایک ایسی دنیا میں ظلم کرتا ہے جہاں شیر اور اژدہے تک کی سطح پر اس کو ظالم نہ بننے کا سبق دیا جا رہا ہے۔

ضروری گزارش

۱۔ خط و کتابت اور منی آڈر میں اپنا خریداری نمبر یا ایجنسی نمبر ضرور لکھیں۔

۲۔ منی آڈر کوپن پر اپنا پورا پتہ تحریر فرمائیں۔

ناکامی زینہ بن گئی

اسپنسرس مدراس شہر کی ایک بہت مشہور دکان ہے۔ ایک بار آگ نے اس دکان کو برباد کر دیا۔ مگر اس نے بہت جلد اپنی تجارت دوبارہ بحال کرلی۔ اس طرح کہ اس نے اپنی دکان کے سامنے ایک تختہ لگادیا جس پر لکھا ہوا تھا : یقین جانئے ، ہماری دکان آج واحد دکان ہے جہاں صرف تازہ مال موجود ہے :

When a fire devastated Spencers, Madras city's most famous store, it quickly regained business by putting up a sign reading: "You bet ours is the only store today with nothing but fresh stocks."

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آدمی بربادی سے دوچار ہونے کے بعد اگر اپنی عقل کو نہ کھوئے تو وہ نہ صرف دوبارہ کامیابی حاصل کرسکتا ہے۔ بلکہ اپنی ناکامی کو اپنے لئے نئی کامیابی کا زینہ بنا سکتا ہے۔ مدراس کی مذکورہ دکان آگ سے جل کر تباہ ہوگئی تھی۔ بظاہر یہ بربادی کا واقعہ تھا۔ مگر اس واقعہ کو دکاندار نے زینہ کے طور پر استعمال کیا۔

دکان کے آگ میں جل جانے کے معنی یہ ہیں کہ پچھلا سامان جو دکان میں تھا سب ختم ہو چکا ہے۔ اب دکاندار نے فوراً نیا سامان لاکر دکان میں رکھ دیا اور پھر خریدار کی اس نفسیات کو استعمال کیا کہ وہ ہمیشہ تازہ بنا ہوا مال پسند کرتا ہے۔ اس نے جب مذکورہ اعلان کیا تو عوام نے فوراً اس کو صحیح سمجھ لیا۔ کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ یہ دکان آگ میں جل کر تباہ ہو چکی ہے۔ انھوں نے یقین کرلیا کہ اس کا سب سامان بالکل نیا ہے۔ اور خریداری کے لئے ٹوٹ پڑے۔ گزرے ہوئے نقصان کو اس نے بہت جلد زیادہ بکری کے ذریعہ حاصل کرلیا۔

اس دنیا کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ یہاں کوئی ناکامی ایسی نہیں جو آدمی کو آخری طور پر ناکام کردے۔ یہاں ہر ناکامی میں ایک نئی کامیابی کا امکان چھپا ہوا ہے، تاہم یہ امکان چیختا ہوا نہیں آتا۔ اس کو اپنی عقل سے سوچ کر نکالنا پڑتا ہے۔ آدمی کو چاہیئے کہ کسی نقصان یا بربادی سے دوچار ہونے کے بعد وہ مایوسی یا شکایت میں نہ پڑے بلکہ اپنی عقل کو نئی راہ تلاش کرنے میں لگادے۔ وہ پائے گا کہ جہاں اس کے لئے ایک امکان ختم ہوا تھا وہیں دوسرا زیادہ بہتر امکان اس کا انتظار کر رہا ہے۔

خواتین اسلام

مشہور حدیث ہے کہ طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم (علم کو حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے) بظاہر اس حدیث میں صرف مسلم کا لفظ ہے، مسلمہ کا لفظ نہیں ہے۔ مگر علم کا حصول مسلم خواتین پر بھی فرض ہے۔ محدثین نے صراحت کی ہے کہ اس حدیث میں "مسلمہ" کا لفظ بھی تبعاً شامل ہے۔ (ابن ماجہ)

رجال اور طبقات کی کتابوں میں مردوں کی طرح عورتوں کی علمی خدمات کے تذکرے موجود ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ دور اوّل میں خواتین کے درمیان علم کا کافی رواج تھا۔ امام بخاری نے چودہ سال کی عمر میں علم کے لئے سفر کیا تو وہ اس قابل ہو چکے تھے کہ بڑے بڑے اساتذہ سے استفادہ کر سکیں۔ ان کے اندر یہ استعداد ان کی والدہ اور ان کی بہن نے پیدا کی تھی۔ امام ابن جوزی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کو ابتدائی تعلیم اپنی پھوپھی سے ملی۔ ابن ابی اصیبعہ کی بہن اور بیٹی علم طب کی ماہر تھیں اور آجکل کی زبان میں "لیڈی ڈاکٹر" تھیں۔ امام ابن عساکر نے فن حدیث کی تعلیم جن اساتذہ سے حاصل کی ان میں ایک سے زیادہ خواتین کے نام بھی آتے ہیں۔

دور اوّل میں علمی سرگرمی سب سے زیادہ احادیث اور آثار کی روایت کا نام ہوتی تھی۔ اس زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ کے ساتھ صحابیات اور تابعین کے ساتھ تابعات نے بھی کثرت سے احادیث کو محفوظ کرنے اور بیان کرنے کا کام کیا ہے۔ حضرت عائشہ نے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لئے ہوئے بہت سے علوم امت کو منتقل کئے اسی طرح اس زمانہ میں بہت سی خواتین ہیں جنھوں نے اپنے والدین اور اپنے ان رشتہ داروں سے روایات بیان کی ہیں جنھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا یا آپ کے اصحاب سے علم دین کی کوئی بات پائی تھی۔ ان خواتین نے اپنے رشتہ کے اہل علم سے اسلامی تعلیمات کو سیکھا اور ان کو دوسروں تک پہنچایا۔

اعلان

الرسالہ دسمبر ۱۹۸۳ میں ایک مقالہ چھپا تھا جس کا عنوان تھا "منزل کی طرف" اس مقالہ کا ترجمہ مرہٹی زبان میں کیا گیا ہے اور وہ پمفلٹ کی صورت میں شائع ہو چکا ہے اس کی قیمت دو روپیہ ہے۔ اور وہ حسب ذیل پتہ سے مل سکتا ہے۔

فٹ ویل سیٹ سنٹر ۱۰۵۰ رویوار پیٹھ پونہ ۲۔

Fitwel Seat Centre, 1050 Reviwar Peth, Phone 411 002

کہاں سے کہاں

۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ کو صبح سوا نو بجے کا وقت تھا۔ نئی دہلی میں وزیر اعظم ہند کی سرکاری رہائش گاہ میں حسب معمول پولیس اور اسٹاف کی سرگرمیاں اپنے شباب پر تھیں۔ پیشگی اپائنٹمنٹ کے مطابق وسیع اور شاندار لان میں پیٹر اسٹینوف اپنی پارٹی کے ساتھ آچکے تھے۔ وہ وزیر اعظم اندرا گاندھی (۱۹۸۴-۱۹۱۷) پر ایک فلم تیار کر رہے تھے۔ وزیر اعظم اپنے وقت پر اپنے کمرہ سے برآمد ہوئیں۔ وہ لان میں داخل ہونے ہی والی تھیں کہ گولیوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ مسز اندرا گاندھی کی حفاظتی پولیس کے دو سکھ جوانوں نے اچانک ان پر حملہ کر دیا۔ ایک نے پستول سے فائر کئے، دوسرے نے اپنے اسٹن گن کی ۳۰ گولیاں ان کے اوپر خالی کر دیں۔ خون میں لت پت اندرا گاندھی کوئی آخری کلمہ نہ بول سکیں۔ وہ "بے ہوش" حالت میں اسپتال لے جائی گئیں، صرف اس لئے کہ ڈاکٹر ان کی طبی موت کا آخری اعلان کر سکیں۔ اس سلسلہ میں اخبارات میں جو رپورٹیں شائع ہوئی ہیں، ان میں سب سے زیادہ عبرت انگیز مسٹر پیٹر اسٹینوف کا واقعہ تھا:

Peter Ustinov, world renowned actor, director and writer, was sitting in the lawn at Mrs Indira Gandhi's residence, waiting to interview her ("I wanted to ask her how as a single child she came to terms with her loneliness") when he heard the 'sound of death'.

مسٹر اسٹینوف جو عالمی شہرت رکھنے والے ایکٹر ہیں، ڈائرکٹر اور رائٹر ہیں، وہ مسز اندرا گاندھی کی رہائش گاہ کے لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ان سے انٹرویو کے منتظر تھے۔ انھوں نے کہا کہ میں ان سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ واحد اولاد ہونے کے اعتبار سے انھوں نے کس طرح اپنے اکیلے پن کے ساتھ نباہ کیا۔ عین اسی وقت اسٹینوف نے موت کی آواز سنی (ہندستان ٹائمس یکم نومبر ۱۹۸۴)

راقم الحروف نے جب یہ رپورٹ پڑھی تو معاً مجھ کو یہ خیال آیا کہ اگر الفاظ کے اندر تھوڑی سی تبدیلی کر دی جائے تو غالباً یہ اہم ترین سوال تھا جو اس نازک لمحہ میں مسز اندرا گاندھی سے پوچھا جا سکتا تھا۔ الفاظ میں معمولی تبدیلی کے بعد وہ سوال یہ تھا ـــــ اب تک آپ ۷۰ ملین انسانوں کے ملک کی محبوب وزیر اعظم تھیں۔ اگلے لمحہ آپ کا کیا حال ہوگا جب کہ آپ اپنے کو ایک ایسی دنیا میں پائیں گی جہاں آپ بالکل تنہا اور بے یار و مددگار ہوں گی۔

کیسا عجیب ہے وہ پانا جس کا انجام کھونے کے سوا اور کچھ نہ ہو۔

خلائی تہذیب

مغربی دنیا پچھلے ۳۰ سال سے ایک انوکھی تحقیق میں مشغول ہے۔ یہ ہے خلا میں زندہ مخلوقات کی آواز کو سننا :

Listening for life in space

بظاہر اس تلاش کا محرک جدید علماء کا وہ مفروضہ ہے جس کو ارتقاء کہا جاتا ہے۔ مغربی علماء نے زندگی کی جو ارتقائی توجیہہ کی ہے، اس کے مطابق لازم آتا ہے کہ وسیع خلا میں دوسرے مقامات پر بھی اسی طرح زندگی کی انواع موجود ہوں جس طرح وہ ہماری زمین پر پائی جاتی ہیں۔ خلا میں سفر کا ایک خاص مقصد ان زندگیوں سے ملاقات ہے۔ اس مفروضہ پر ان کو اتنا یقین ہے کہ اس کا ایک خاص نام بھی دے دیا گیا ہے یعنی بالائے ذات تہذیب (Extra-terrestrial civilization)

اس کے علاوہ امریکہ میں اور دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں خاص طرح کے بہت بڑے بڑے اینٹینا (Antenna) لگائے گئے ہیں جن کو عام زبان میں ریڈیائی کان (Radio ears) کہتے ہیں۔ ان مشینوں سے بالائے خلا میں سگنل بھیجے جاتے ہیں اور حساس قسم کے آلات ہر وقت تیار رہتے ہیں کہ اوپر سے آنے والے متوقع سگنل کو سن سکیں۔

ایک مبصر نے ان کوششوں پر تبصرہ (ٹائم میگزین ۲۱ مارچ ۱۹۸۳) کرتے ہوئے اس کی روح کو ان مختصر لفظوں میں بیان کیا ہے: اگر تم واقعۃً وہاں ہو تو اپنے دوستوں سے بولو:

If your are really there, please call your friends.

زمین پر زندگی اور شعور کا وجود ساری معلوم کائنات میں ایک انتہائی نادر اور مستثنیٰ واقعہ ہے۔ چونکہ یہ شعور اپنا خالق آپ نہیں، اس لئے اس کا وجود لازمی طور پر تقاضا کرتا ہے کہ یہاں زندگی اور شعور کا ایک اور خزانہ زیادہ بڑی سطح پر موجود ہو جو زمین کی زندگی اور شعور کا سرچشمہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ زندہ انسان کی موجودگی زندہ خدا کی موجودگی کا ثبوت ہے۔ جدید انسان اس امکان کو بالواسطہ انداز میں تسلیم کرتا ہے۔ البتہ وہ اس وجود کو خلائی زندگی قرار دے کر یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ یہ وجود ہماری ہی طرح کا ایک وجود ہے نہ کہ ہم سے برتر کوئی وجود۔ وہ محض ایک تہذیب ہے نہ کہ کوئی خالق اور مالک خدا۔

کمینہ پن

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مسلمانوں کے ہاتھوں سے قتل کیا جانا اسلامی تاریخ کا سب سے زیادہ منحوس واقعہ ہے۔ بلوائیوں نے آپ کے مکان کو گھیر رکھا تھا۔ یہ گھیراؤ لگ بھگ دو مہینے جاری رہا۔ اس دوران بلوائیوں نے ہر قسم کی رسد بند کر دی۔ حتی کہ پانی بھی حضرت عثمان کے گھر کے اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ حضرت علی کو معلوم ہوا تو وہ خود پانی کی تین مشکیں لے کر آئے۔ ان کو بھی بلوائیوں نے روکنے کی کوشش کی۔ تاہم کسی نہ کسی تدبیر سے آپ نے پانی اندر بھجوا دیا۔

اس موقع پر حضرت علی نے بلوائیوں سے کہا:

واللہ ان فارس والروم لا یفعلون کفعلکم ھذا بھذا الرجل واللہ انھم لیاسرون ویطعمون ویسقون فابوا ان یقبلوا منہ

خدا کی قسم فارس اور روم والے بھی وہ نہیں کرتے جو تم اس آدمی کے ساتھ کر رہے ہو۔ خدا کی قسم وہ قید کرتے ہیں تو قیدی کو کھلاتے ہیں اور پلاتے ہیں مگر انھوں نے ماننے سے انکار کر دیا۔

ایک آدمی کو دوسرے آدمی سے اختلاف و شکایت ہو جائے تو اپنے مخالف سے معاملہ کرنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ جو کچھ کیا جائے شرافت اور انسانیت کے دائرہ میں رہ کر کیا جائے۔ دوسرا یہ کہ اندھی دشمنی کا طریقہ اختیار کر لیا جائے۔ اسی دوسرے طریقہ کا نام کمینہ پن ہے۔

پہلی قسم کے لوگ اپنے دشمن کے خلاف بس اتنا ہی کرتے ہیں جتنا ان کے اپنے مفاد کے تحفظ کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اپنے مفاد کو محفوظ کر لینے کے بعد انھیں دشمن سے کوئی نفرت نہیں ہوتی۔

مگر کمینہ فطرت لوگوں کا معاملہ اس سے مختلف ہوتا ہے۔ وہ اپنے مفروضہ دشمن کے آخری حد تک مخالف ہو جاتے ہیں۔ اس کو بے عزت کرنا، اس کی معاشیات کو اجاڑنا، اس کی پوری نسل کو اپنی قوت کا مزہ چکھانا۔ اس کے خلاف جھوٹی باتیں مشہور کرنا، اس کو کسی طرح چین نہ لینے دینا، غرض اسکے خلاف وہ ہر وہ کاروائی کر گزرتے ہیں جو ان کے بس میں ہو۔

غیر کمینہ آدمی مخالفت کے بعد ایک حد کے اندر رہتا ہے۔ مگر کمینہ آدمی کسی حد کو نہیں جانتا۔ مخالفت پیدا ہونے کے بعد وہ اپنے مخالف کے ساتھ ہر ظالمانہ کارروائی کو درست سمجھ لیتا ہے، خواہ وہ کتنی ہی ظالمانہ ہو، خواہ وہ کتنی ہی غیر انسانی کیوں نہ ہو۔

مومن کا قول

وہ قول (یا کلمۂ ایمان) کیا ہے جو اللہ کی نظر میں حقیقۃً قول قرار پاتا ہے، اس کا جواب قرآن میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ یہاں اس سلسلہ میں چند حوالے درج کئے جاتے ہیں:

وہ قول جو آدمی کے داخل قلب سے نکلا ہو نہ کہ محض زبان اور حلق سے	الحجرات	۱۴
جو اتنی گہری معرفت حق کا نتیجہ ہو کہ آدمی کی آنکھوں سے آنسو بہہ پڑیں	المائدہ	۸۶-۸۸
جو ملاقات رب کی نفسیات سے ابلا ہوا کلام ہو	البقرہ	۲۴۹
جو ایسے دل سے ابلے جس کا ایمان برابر بڑھتا رہتا ہے۔	آل عمران	۱۷۳
جب کہ آدمی وہی کہے جو اس کے اندر کی ہستی کا واقعی فیصلہ ہو	الصف	۳
جو پائی ہوئی بات کا اظہار ہو نہ کہ محض اوپر سے سنی ہوئی بات کا	الانفال	۲۱
وہ احساس عبدیت سے نکلا ہوا قول ہو	آل عمران	۱۴۷
وہ ایک نمو پذیر قول ہو جو بڑھتے بڑھتے آدمی کے اندر خدا کا شاداب درخت بن جائے	ابراہیم	۲۴
وہ دل کی گہرائی سے نکلا ہو نہ کہ محض آدمی کے منھ سے	المائدہ	۴۴
وہ قول سدید ہو، یعنی بالکل مطابق واقعہ ہو، جو آدمی کے اندر ہو وہی اس کے باہر ہو	الاحزاب	۷۰
وہ قول طیب ہو، یعنی ایسا پاک قول ہو جس میں کوئی غیر فطری آمیزش شامل نہ ہو	الحج	۲۴
وہ قول اقوم ہو، یعنی سیدھا آدمی کے دل سے نکلا ہوا کلام ہو	المزمل	۶
وہ قول جو عہد کے ہم معنی ہو جس کو آدمی کسی حال میں نہ بدلے	الاحزاب	۲۳
وہ قول جو اتنا گہرا ہو کہ آدمی کو اختلاف سے بچا سکے	البقرہ	۲۵۳
وہ قول جو آدمی کے اندر توکل علی اللہ کی کیفیت پیدا کر دے	یونس	۸۴
وہ قول جو معرفت حق کے نتیجہ میں ظاہر ہوا ہو	البقرہ	۲۶
وہ قول جو آدمی کے اندر خدا کی شدید محبت کا نتیجہ ہو۔	البقرہ	۱۶۵
وہ قول جو آدمی کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لایا ہو	البقرہ	۲۵۷
وہ قول جو آدمی کو خدا اور رسول کی اطاعت پر مجبور کر دے	النساء	۵۹
وہی قول اللہ تک جاتا ہے جو پاک قول ہو اور جس کے ساتھ عمل شامل ہو۔	فاطر	۱۰

خدا کو چھوڑ کر

ایک صاحب نے پرجوش انداز میں فرمایا کہ اسلام نقوش سے نہیں بلکہ نفوس سے حاصل ہوتا ہے۔ نقوش (کتابیں) جامد چیزیں ہیں اور جمود سے حرکت پیدا نہیں ہوسکتی۔ نفوس (شخصیتیں) زندہ اور متحرک ہوتی ہیں اور حرکت اور زندگی ہمیشہ حرکت اور زندگی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے لوگوں کو چاہئے کہ بزرگ شخصیتوں سے وابستہ ہوں اور ان سے اسلام سیکھیں۔

بظاہر یہ بات بڑی خوشنما معلوم ہوتی ہے مگر وہ سراسر بے بنیاد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دین نہ نقوش سے ملتا ہے اور نہ نفوس سے۔ وہ صرف خدا سے ملتا ہے۔ آدمی خدا کی کتاب پڑھے۔ وہ اس کے رسول کی سنت کا مطالعہ کرے۔ وہ اس کی کائنات میں اس کی پھیلی ہوئی نشانیوں پر غور کرے اور پھر بار بار دعا کرتا رہے تو یقیناً اس کو دین مل جائے گا۔ یقیناً خدا سے اس کا ربط قائم ہو جائے گا جو اصل مطلوب ہے۔

عجیب بات ہے کہ لوگوں کو فانی انسان دکھائی دیتے ہیں مگر خدا دکھائی نہیں دیتا۔ وہ انسان جو کسی ایک جگہ ہے اس سے ان کی ملاقات ہو جاتی ہے مگر وہ خدا جو ہر جگہ ہے اس سے ان کی ملاقات کی نوبت نہیں آتی۔ وہ انسان جو کوئی ایک یا دو زبان بولتا ہے اس کی بات ان کی سمجھ میں آجاتی ہے مگر وہ خدا جو ہر زبان بولتا ہے اس کی بات سمجھنے سے وہ قاصر رہتے ہیں۔

کیسی عجیب بات ہے کہ لوگ دور دور کے انسانوں کو جانتے ہیں مگر وہ خدا کو نہیں جانتے جو ان سے سب سے زیادہ قریب ہے۔ کوئی شخص کتابوں میں اٹکا ہوا ہے اور کوئی شخص انسانی شخصیتوں میں۔ خدا سب سے بڑی حقیقت کے طور پر ہر شخص کے قریب ترین موجود ہے مگر وہ کسی کو دکھائی نہیں دیتا۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اے پیغمبر، جب میرے بندے میرے بارہ میں پوچھیں تو کہہ دو کہ میں قریب ہوں اور پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہوں (البقرہ) پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ خدا اور بندے کے درمیان کسی تیسرے وسیلہ کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص براہ راست خدا کو پا سکتا ہے۔ ہر آدمی براہ راست خدا تک پہنچ سکتا ہے۔ مگر پیغمبر کے وارثین پیغمبر کے نام پر یہ تبلیغ کر رہے ہیں کہ خدا تک پہنچنا چاہتے ہو تو کسی شخصیت کے حلقہ بگوش ہو جاؤ۔ کسی بزرگ کا دامن تھام لو۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام تر خود ساختہ دین ہے اور خود ساختہ دین کبھی کسی کو خدا تک نہیں پہنچا سکتا۔

دولت کا فریب

کوالالمپور کے اخبار نیو اسٹریٹس ٹائمس (New Straits Times) کی اشاعت ۲۸ جولائی ۱۹۸۴ میں ایک خبر نظر سے گزری۔ ایک اطالوی نژاد امریکی کارپینٹر وینیرو پیگانو (Venero Pagano) جس کی عمر ۶۲ سال ہے اور وہ نیو یارک کے قریب رہتا ہے۔ وہ آٹھ سال سے بے روزگار تھا اور یونین کی پنشن سے اپنا کام چلا رہا تھا۔ اس کے پاس اتنی رقم بھی نہ تھی کہ اپنے مکان سے متصل زمین پر حسب منشا ٹماٹر کی کاشت کر سکے۔

مذکورہ کارپینٹر نے لاٹری کا ایک ٹکٹ خریدا۔ ۲۷ جولائی ۱۹۸۴ کو اچانک اسے معلوم ہوا کہ اس کو اول انعام ملا ہے۔ یہ انعام ۲۰ ملین ڈالر تھا۔ یہ اب تک کے لاٹری انعاموں میں دنیا بھر میں سب سے بڑا انعام ہے۔

انعام کی خبر سب سے پہلے ٹیلی وژن پر آئی۔ اس کے فوراً بعد اس کے لئے پریس کانفرنس کی گئی۔ اس نے اخبار نویسوں کو بتایا کہ خبر کو سن کر میں ششدر رہ گیا۔ میں بار بار اپنے نمبر کو اعلان شدہ نمبر سے ملا کر چیک کرتا رہا اور ابھی تک مجھے یقین نہیں ہے کہ یہ انعام مجھ کو ملا ہے۔ خبر سن کر وہ بھاگ کر اندر کمرہ میں گیا اور اپنی بیوی کو جگا کر کہا کہ "میرا خیال ہے کہ ہم لوگ کروڑ پتی ہو گئے ہیں۔" اس نے اخبار نویسوں سے کہا کہ مجھ کو جو ضرورت تھی وہ میں نے پالیا۔ میں نے اپنا مکان پالیا۔ میں نے اپنے ٹماٹر پالئے۔

I got whatever I need. I got my house. I got my tomatoes.

دنیا میں آدمی کے پاس دولت ہو تو اس کا ہر کام پورا ہو جاتا ہے۔ اس لئے آدمی سمجھتا ہے کہ دولت سب کچھ ہے۔ دولت مل جائے تو آدمی سمجھتا ہے کہ اس نے سب کچھ پالیا۔ حالاں کہ سب کچھ پانا یہ ہے کہ آدمی آخرت میں خدا کی رحمتوں کو پالے۔

موت سے پہلے کی زندگی میں آدمی جن مسائل سے دوچار ہے ان سے بالکل مختلف وہ مسائل ہوں گے جن سے آدمی موت کے بعد کی زندگی میں دوچار ہوگا۔ آج دولت کی اہمیت ہے، اس وقت ایمان اور عملِ صالح کی اہمیت ہوگی۔ آج چیزیں بازار سے حاصل ہوتی ہیں، اُس وقت تمام چیزیں خدا کی رحمت کے خزانے سے ملیں گی۔ آج مادی قوانین کے تحت آدمی کو مقام ملتا ہے، اس وقت اخلاقی قوانین یہ فیصلہ کریں گے کہ آدمی کو کیا ملے اور کیا نہ ملے۔

مجرم کے ساتھ بھی

يروي ابوداؤد عن ابي هريرة ان الرسول صلى الله عليه وسلم اتى برجل قد شرب فقال: اضربوه. قال ابو هريرة فمنا الضارب بيده والضارب بنعله والضارب بثوبه فلما انصرف قال بعض القوم: اخزاك الله فقال الرسول صلى الله عليه وسلم لا تقولوا هكذا ولا تعينوا عليه الشيطان۔

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی لایا گیا جس نے شراب پی تھی۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو مارو ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ ہم میں سے کسی نے اپنے ہاتھ سے مارنا شروع کیا، کسی نے اپنے جوتے سے اور کسی نے اپنے کپڑے سے۔ جب مار چکے تو لوگوں میں سے کسی شخص نے کہا کہ خدا تجھے رسوا کرے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ایسا مت کہو۔ اور اس کے اوپر شیطان کی مدد نہ کرو (ابوداؤد)

اسلام میں مجرم کو جو سزا دی جاتی ہے وہ نفرت کے جذبہ کے تحت نہیں دی جاتی بلکہ صرف حدود اللہ کی ادائیگی کے لئے دی جاتی ہے۔ سزا دینے والے کے اندر اگر مجرم کے مقابلہ میں اپنی بڑائی کا احساس پیدا ہو جائے تو یہ بھی اس کے لئے ایک جرم ہوگا۔ کسی کو سزا دینے کا اختیار صرف اس شخص کو ہے جو نفرت کے جذبات سے بلند ہو کر اسے سزا دے۔

مجرم پر حد جاری کرنے کے بعد اسے برا بھلا کہنا خدا کی سزا پر انسانی سزا کا اضافہ ہے جس کا حق کسی کو بھی نہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ حد جاری کرتے ہوئے بھی آپ کو مجرم کے ساتھ بے پناہ ہمدردی تھی۔ آپ نے یہ نہیں چاہا کہ لوگوں کے برا بھلا کہنے سے مجرم کے اندر ردعمل پیدا ہو اور وہ ندامت اور اصلاح کی طرف رغبت کرنے کے بجائے سرکشی اور بغاوت کی طرف مائل ہو جائے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جن کو خدا کی طرف سے یہ اجازت نامہ حاصل ہوتا ہے کہ وہ خدا کے بندوں کے اوپر داروغہ بن کر کھڑے ہوں اور ان کے اوپر خدا کی مقرر کی ہوئی سزائیں نافذ کریں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی انسانوں سے محبت اتنی زیادہ بڑھی ہوئی ہو کہ وہ مجرم کے لئے بھی باقی رہے۔ وہ جرم کے ارتکاب کے باوجود ایک شخص سے نفرت نہ کر سکیں۔ وہ خیر خواہی کی حد تک ہر انسان سے دل چسپی رکھنے والے ہوں۔

آج کا انسان

دیکھنے میں ایک انسان دوسرے انسان سے الگ دکھائی دیتا ہے مگر حقیقت کے اعتبار سے سارے انسان یکساں ہیں۔ بولنے کے وقت لوگ الگ الگ الفاظ بولتے ہیں مگر کرنے کے وقت سارے لوگ ایک ہوجاتے ہیں۔

بظاہر کوئی اِس قوم سے تعلق رکھتا ہے اور کوئی اُس قوم سے۔ کوئی جزئی دین کا علمبردار ہے اور کوئی کلی دین کا۔ کوئی انسانیت کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہے اور کوئی قومیت کا۔ کوئی انفرادی انقلاب پر تقریر کر رہا ہے اور کوئی اجتماعی انقلاب پر۔ کوئی توحید کا چیمپین بنا ہوا ہے اور کوئی قبر پرستی اور بزرگ پرستی کا۔ کوئی زمین کا احتساب کر رہا ہے اور کوئی آسمان کا۔

مگر یہ سارے فرق کہنے کے اعتبار سے ہیں۔ جب کرنے کا وقت آتا ہے تو سب کے سب ایک ہوجاتے ہیں۔ اب ہر ایک کا دین وہی بن جاتا ہے جس کو دوسرا شخص اپنا دین بنائے ہوئے ہیں۔ قول کے اعتبار سے سب کا دین الگ الگ ہے مگر عمل کے اعتبار سے سب کا دین ایک ہے۔

جہاں ذاتی مفاد کا معاملہ ہو وہاں لوگوں کی تمام قوتیں جاگ اٹھتی ہیں اور جہاں ذاتی مفاد نہ ہو وہاں وہ بالکل بے حس بنے رہتے ہیں۔ کوئی اپنے سے بڑھتا ہوا نظر آئے تو سارے لوگ حسد میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور جو شخص اپنے سے کم نظر آئے اس کو وہ حقیر سمجھ لیتے ہیں۔ اپنا آدمی ہو تو اس کی ہر بات صحیح نظر آتی ہے اور اگر غیر آدمی ہو تو اس کی ہر بات غلط دکھائی دیتی ہے۔ تعریف کرنے والے کی ہر شخص کے نزدیک زبردست قیمت ہے۔ اور جو شخص تنقید کرے وہ ہر ایک کی نظر میں بے قیمت ہو جاتا ہے۔ اپنے موافق بات کو سمجھنے کے لئے ہر آدمی ہوشیار ہے اور اپنے مخالف بات کو سمجھنے کے لئے ہر آدمی بے وقوف۔ جس سے کسی قسم کا مفاد وابستہ ہو اس کے لئے ہر آدمی با اخلاق بن جاتا ہے۔ اور جس سے کوئی مفاد وابستہ نہ ہو اس کے لئے ہر آدمی بے اخلاق ہے۔ کسی سے شکایت ہو تو اس کے بارہ میں آدمی ہر الٹی خبر کو بلا تحقیق مان لیتا ہے۔ اور جس سے دوستی ہو اس کے خلاف کوئی یقینی خبر ملے تب بھی وہ ماننے کو تیار نہیں ہوتا۔

تقریر کی سطح پر ہر آدمی الگ الگ تقریر کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر جینے کی سطح پر دیکھئے تو ہر آدمی ایک ہی سطح پر نظر آئے گا اور کسی آدمی کا دین وہی ہے جہاں وہ جی رہا ہے نہ کہ وہ جہاں وہ الفاظ کی نمائش کر رہا ہے۔

دنیا کے تابع

سومناتھ مندر جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ۶ جنوری ۱۰۲۶ کو محمود غزنوی نے اسے ڈھا دیا تھا اور پھر وہ دوبارہ بنایا گیا، یہاں آجکل ایک عجیب نزاع برپا ہے۔ اس تاریخی مندر میں مختلف مذہبی امور کی ادائگی کے لئے ۱۲۵ آدمی مقرر ہیں۔ ان کو مندر کی طرف سے ماہانہ تنخواہ ملتی ہے۔ اس تنخواہ کی مقدار ۲۵۰ روپئے ماہوار سے لے کر ۴۰۰ روپے ماہوار تک ہے۔ یہ تنخواہ ان کارکنوں کو کم محسوس ہوتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے تنخواہ میں اضافہ کے لئے لیبر کورٹ میں دعویٰ کر دیا۔

مندر ٹرسٹ جس کے صدر مسٹر مرارجی ڈیسائی ہیں، اس کا کہنا ہے کہ سومناتھ مندر ایک مذہبی وقف ہے اور اس کا معاملہ ریلیجس ٹرسٹ ایکٹ کے تحت آتا ہے۔ دوسری طرف کارکنوں کا کہنا ہے کہ وہ ایک صنعت ہے اس کا معاملہ انڈسٹریل ڈسپیوٹس ایکٹ کے تحت طے کیا جانا چاہئے۔ مندر کے کارکنوں کا فائدہ اس میں ہے کہ مندر کو ایک صنعت قرار دیا جائے اور اس کا معاملہ انڈسٹریل ڈسپیوٹس ایکٹ کے تحت لیبر کورٹ میں طے کیا جائے۔ اس طرح ان کو صنعتی مزدوروں والی مراعات حاصل ہو جائیں گی جو ریلیجس ٹرسٹ ایکٹ کے تحت انھیں نہیں مل سکتیں (ٹائمس آف انڈیا یکم ستمبر ۱۹۸۴)

بظاہر یہ بڑی عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن گہرائی کے ساتھ غور کیجئے تو آج تمام مذہب والوں کا یہی حال ہے، حتی کہ خود مسلمانوں کا بھی۔

مسلمان آج اسلامی تعلیمات کی تشریح عوامی خواہشات کی روشنی میں کرتے ہیں کیوں کہ اس طرح انھیں عوامی مقبولیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اگر وہ خالص حق کی روشنی میں اسلام کی تشریح کریں تو عوام کی بھیڑ فوراً ان کا ساتھ چھوڑ دے۔ وہ اسلام کو زمانہ کے تابع کر کے پیش کرتے ہیں تاکہ ہر ایک کی موافقت انھیں حاصل رہے۔ اگر وہ زمانہ کو اسلام کے تابع بنا کر پیش کریں تو کوئی ان کو ساتھ دینے والا نہ ملے۔

دین اصلاً آخرت کی چیز ہے۔ مگر دین کو آخرت کی چیز کی حیثیت سے لینے میں زیادہ قیمت ملتی ہوئی نظر نہیں آتی، اس لئے ہر آدمی دین کو دنیا کی چیز بنا کر اختیار کرنا چاہتا ہے۔ تاکہ وہ اس کی زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کر سکے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو سومناتھ کو ڈھانے والے بھی وہیں نظر آئیں گے جہاں سومناتھ کو آباد کرنے والے نظر آتے ہیں۔

اسلامی بینک

اسلام نے سود کو حرام قرار دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اسلامی بینک بنایا جائے تو اس میں لین دین کی بنیاد نفع میں شرکت ہوگی نہ کہ سود جس پر موجودہ زمانہ میں بینکنگ کا نظام چل رہا ہے۔

سودی نظام میں قرض دینا ایک تجارت ہے۔ کیوں کہ وہ ایک مقررہ شرح کے مطابق اضافہ ہو کر قرض دینے والے کو لوٹتا ہے۔ مگر اسلامی معاشرہ میں قرض دینا ایک انسانی عمل ہے نہ کہ کاروباری عمل۔ اسلامی معاشرہ میں ایک شخص دوسرے شخص کو قرض دیتا ہے تاکہ اس کی ضرورت پوری ہو۔ اور بعد کو وہ اس کی اصل رقم اسے لوٹا دے۔ اس کے برعکس سودی نظام میں قرض اس لئے دیا جاتا ہے کہ وہ یقینی نفع کے ساتھ قرض دینے والے کی طرف لوٹے۔

اسلامی شریعت میں تجارتی قرضہ کو مضاربت کہا جاتا ہے۔ یعنی نفع نقصان دونوں میں شرکت کی بنیاد پر قرض دینا۔ الف کی رقم پر جیم ایک کاروبار کرتا ہے۔ اگر اس میں اس کو نفع ہو تو حسب معاہدہ دونوں اس کے نفع کو تقسیم کرلیں گے۔ اور اگر نقصان ہوجائے تو جتنا نقصان ہوا ہے وہ قرض دینے والے کو برداشت کرنا پڑے گا۔

ایک انفرادی شخص اگر دوسرے انفرادی شخص کو قرض دے تو اس میں یقیناً نفع اور نقصان دونوں کا امکان ہے۔ لیکن اگر یہ کام اجتماعی بینکوں کے ذریعہ ہو تو عملاً نقصان صفر کے برابر ہوجاتا ہے۔ بینک کی صورت میں ہزاروں آدمیوں کا سرمایہ ایک ادارہ میں جمع ہوگا اور پھر سیکڑوں اور ہزاروں تاجروں کو بطور قرض دیا جائے گا۔ ایسی صورت میں اگر ان میں سے چند کو نقصان ہوجائے تو بینک کا مجموعی کاروبار پھر بھی نفع میں رہے گا۔ اس کا نقصان غیر مرئی ہو کر رہ جائے گا۔

اس کو انشورنس کمپنیوں کی مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ انشورنس کمپنیاں حادثات اور نقصانات کا بیمہ کرتی ہیں، اس کے باوجود ان کو نفع ہوتا ہے۔ حالاں کہ اگر ان کے تمام گاہکوں کو نقصان اور حادثہ پیش آنے لگے تو فائدہ کا کوئی سوال ہی نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عملی طور پر نقصان یا حادثہ چند ہی افراد کو پیش آتا ہے، بیشتر لوگ اس سے محفوظ رہتے ہیں۔ زندگی کے اس قانون کا فائدہ انشورنس کمپنی کو ملتا ہے اور چند افراد کے معاملہ میں نقصان اٹھانے کے باوجود آخری طور پر انھیں نفع حاصل ہوتا ہے۔ انفرادی مضاربت میں یقیناً گھاٹے کا بھی اندیشہ ہے مگر بینکوں کے ذریعہ اجتماعی مضاربت اسی طرح عملاً نفع بخش بن جاتی ہے جیسے موجودہ سودی بینکنگ۔

تعمیری مزاج

ڈاکٹر عبدالجلیل صاحب (نئی دہلی) ۱۹۷۰ میں جاپان گئے تھے اور وہاں چھ مہینے تک رہے۔ انھوں نے ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۴ کی ایک ملاقات میں بتایا کہ میں ٹوکیو میں مقیم تھا اور اپنے کام کے تحت ٹوکیو سے ایک مقام پر جایا کرتا تھا۔ یہ سفر ٹرین سے پندرہ منٹ میں طے ہو جاتا تھا۔

انھوں نے بتایا کہ ایک روز وہ ٹوکیو سے ٹرین پر سوار ہوئے۔ پندرہ منٹ گزر گئے مگر ان کا مطلوبہ اسٹیشن نہیں آیا۔ ایک اسٹیشن پر ٹرین رکی مگر انھوں نے بورڈ دیکھا تو یہ کوئی دوسرا اسٹیشن تھا۔ اب انھیں تشویش ہوئی۔ ان کو خیال ہوا کہ غالباً وہ کسی غلط ٹرین پر سوار ہو گئے ہیں ڈبہ میں ان کے قریب ایک جاپانی نوجوان کھڑا ہوا تھا۔ مگر زبان کی مشکل تھی۔ کیوں کہ ڈاکٹر صاحب جاپانی زبان نہیں جانتے تھے اور وہ شخص انگریزی زبان سے ناواقف تھا۔ انھوں نے یہ کیا کہ ایک کاغذ پر اپنے مطلوبہ اسٹیشن کا نام لکھا اور جاپانی نوجوان کو اسے دکھایا۔

ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ اس درمیان میں ٹرین چل چکی تھی مگر ابھی اس نے پلیٹ فارم نہیں چھوڑا تھا۔ نوجوان نے ڈاکٹر صاحب کا کارڈ دیکھتے ہی فوراً زنجیر کھینچی۔ ٹرین رکی تو وہ ڈاکٹر صاحب کو لے کر نیچے اترا۔ اب وہ ان کے ساتھ چلنے لگا۔ اس کے بعد اس نے ان کو مخالف سمت سے آنے والی دوسری ٹرین پر بٹھایا اور خود بھی ان کے ساتھ بیٹھا۔ ٹرین دونوں کو لے کر روانہ ہوئی۔ چند منٹ میں ڈاکٹر صاحب کا مطلوبہ اسٹیشن آگیا۔ اب نوجوان ان کو لے کر اترا اور یہاں چھوڑ کر دوسری ٹرین پکڑ کر وہاں کے لئے روانہ ہو گیا جہاں اس کو جانا تھا۔ اس دوران دونوں کے درمیان کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ کیونکہ ڈاکٹر صاحب جاپانی زبان نہیں جانتے تھے اور جاپانی نوجوان انگریزی زبان سے ناواقف تھا۔

اسی طرح مثلاً انھوں نے بتایا کہ میں کسی سڑک پر تھا۔ میں نے دیکھا کہ دو جاپانیوں کی کار آمنے سامنے سے آتے ہوئے ٹکرا گئی، دونوں اپنی گاڑی سے اترے اور ایک دوسرے کے سامنے سر جھکا کر کھڑے ہو گئے؛ ایک نے کہا کہ غلطی میری ہے، مجھے معاف کر دو ــــ دوسرے نے کہا غلطی میری ہے مجھے معاف کر دو۔

اسی کا نام تعمیری مزاج ہے، اور یہی تعمیری مزاج قوموں کی ترقی کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ اسکے برعکس جس قوم کے افراد کا یہ حال ہو کہ وہ صرف اپنے کو جانیں اور دوسرے کو نہ جانیں وہ کبھی کوئی بڑی ترقی حاصل نہیں کر سکتے۔

پردہ ڈالنا

سنگاپور سے انگریزی ناول کی ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام ہے :

The Cry of the Halidon

اس کتاب کے آغاز میں کئی سطر کی ایک عبارت درج ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ اس کتاب کے تمام حقوق محفوظ ہیں اور کسی بھی شکل سے اس کو دوبارہ استعمال نہیں کیا جا سکتا جب تک پبلشر کی پیشگی اجازت حاصل نہ کر لی جائے۔ اس عبارت کے الفاظ یہ ہیں :

All rights reserved. No part of this publication may be reproduced, stored in a retrieval system, or transmitted, in any from, or by any means electronic, mechanical, photocopying, recording, or otherwise, without the prior permission of the publishers.

کتاب پر بحیثیت مصنف کے رابرٹ لڈلم (Robert Ludlum) کا نام درج ہے۔ بظاہر مذکورہ عبارت سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ پبلشر نے مہنگی رائلٹی دے کر اس کے حقوق اشاعت حاصل کئے ہیں اور اب وہ چاہتا ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر کوئی شخص اس میں شریک نہ ہو۔ مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ پوری کتاب سرقہ ہے۔ کتاب کا اصل مصنف جناتھن رائڈر (Jonathan Ryder) ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۷۵ میں لندن سے چھپی تھی۔ عین اسی کتاب کو اسی نام کے ساتھ سنگاپور کے پبلشر نے چھاپ لیا ہے۔ اس کی واحد ترمیم یہ ہے کہ اس نے مصنف کا نام بدل دیا ہے (ہندستان ٹائمس ۲۱ ستمبر ۱۹۸۴)

بعض مرتبہ آدمی سچ صرف اس لئے بولتا ہے کہ اس کے ذریعہ اپنے جھوٹ پر پردہ ڈال سکے۔ وہ حق کا اعلان صرف اس لئے کرتا ہے کہ اپنے باطل کو اس کی آڑ میں چھپا سکے۔ وہ خوب صورت الفاظ کا استعمال صرف اس لئے کرتا ہے کہ اس کے ذریعہ اپنی معنوی بدشکلی کو ڈھانک لے۔ وہ آگ بجھانے کے لئے اس لئے دوڑتا ہے کہ کوئی یہ نہ جانے کہ اسی نے آگ لگائی تھی۔

سنگاپور کے پبلشر نے خود تو سرقہ کیا ہے مگر وہ چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ کوئی شخص سرقہ کا معاملہ نہ کرے۔ خود تو اس نے دوسرے کی چیز لے لی ہے مگر دوسرا کوئی اس سے اسے نہ لے۔ خود غرضی کی یہ قسم بھی کیسی عجیب ہے۔

ایک سفر

المعہد العلمی للفکر الاسلامی (International Institute of Islamic Thought)
مختلف ملکوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب کا ایک ادارہ ہے جس کا مرکزی دفتر واشنگٹن میں ہے۔ اس ادارہ کے ٹرسٹیوں کا ایک بورڈ ہے جس میں حسب ذیل افراد شامل ہیں :

ڈاکٹر عبد الحمید سلیمان ،	صدر
ڈاکٹر اسماعیل راجی الفاروقی ،	ڈائرکٹر
ڈاکٹر طٰہٰ جابر العلوانی	ممبر
ڈاکٹر جمال البرزنجی	ممبر
ڈاکٹر انور ابراہیم (وزیر زراعت ملیشیا)	ممبر

اس ادارہ کا مقصد اس کے الفاظ میں اسلامیۃ المعرفۃ (Islamization of knowledge) ہے۔
اس کے تحت اس کا تیسرا انٹرنیشنل سمینار جولائی ۱۹۸۴ میں کوالالمپور میں ہوا۔ اس سیمنار کو منظم کرنے والا مذکورہ ادارہ تھا۔ اور اس کی میزبانی کے فرائض حکومت ملیشیا کی وزارت ثقافت نے انجام دئے۔ راقم الحروف کو اس سیمنار میں مقالہ پڑھنے کے لئے بلایا گیا تھا۔ اس سلسلے میں کوالالمپور کا سفر ہوا۔ اس اجتماع میں ملیشیا کے علاوہ دوسرے مختلف ملکوں کے تقریباً پچاس افراد شریک ہوئے۔ یہ سب کے سب اعلےٰ تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ اجتماع کی کارروائی انگریزی زبان میں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کا کوئی بین اقوامی اجتماع ہو تو اس کے شرکاء کی اکثریت کے لئے، کم از کم اب تک، سب سے زیادہ قابل فہم زبان انگریزی ہی ہوتی ہے۔

میرے سفر کا راستہ یہ تھا : دہلی۔ بینکاک، کوالالمپور۔ بینکاک۔ دہلی۔ ۱۲ جولائی ۱۹۸۴ کو واشنگٹن (امریکہ) میں ٹکٹ خریدا گیا۔ اور پورے سفر کا رزرویشن " اوکے " ہو کر ۱۷ جولائی کو تھائی ایرویز (نئی دہلی) کی معرفت مجھے اپنے دفتر میں وصول ہوگیا۔ اس کے بعد ۲۳ جولائی کو جب میں دہلی سے روانہ ہوا تو اسی دن دوپہر کے وقت میں کوالالمپور پہنچ چکا تھا۔

موجودہ زمانہ میں دور دراز ملکوں میں سفر کتنا زیادہ آسان ہوگیا ہے۔ خدا نے یہ آسانیاں اس لئے پیدا کی تھیں کہ پیغمبر آخر الزماں کے امتی ان کو استعمال کرکے خدا کے دین کی دعوت ساری دنیا میں پہنچا دیں۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے ان سہولیات کو اپنی بے نتیجہ سیاست

کے لئے توخوب استعمال کیا مگر وہ اسے اللہ کے پیغام کو اہل عالم تک پہنچانے کے لئے استعمال نہ کر سکے۔

یہ عملی غفلت اب فکری غفلت تک جا پہنچی ہے۔ چنانچہ اب یہ حال ہے کہ اگر ان کو اس فریضہ کی طرف توجہ دلائی جائے تو کوئی کہے گا کہ تم مسلمانوں کو جہاد کے محاذ سے ہٹانا چاہتے ہو۔ کسی کا جواب یہ ہوگا کہ ابھی تو مسلمانوں کا اپنا وجود خطرہ میں ہے پھر وہ کوئی دوسرا کام کس طرح کر سکتے ہیں۔ کسی کو کہنے کے لئے یہ الفاظ مل جائیں گے کہ پہلے مسلمانوں کی اصلاح کر لیجئے اس کے بعد دوسروں کی اصلاح کی فکر کیجئے۔

قدیم زمانہ میں مسلمانوں کے اندر دعوت کا جذبہ تھا۔ اس وقت ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچنے کے لئے مہینوں کا وقت درکار ہوتا تھا۔ پھر بھی وہ سمندروں کو پار کر کے دور دراز ملکوں میں پہنچے اور مشرک ملکوں کو موحد ملک بنا دیا۔ آج چوں کہ مسلمانوں کے اندر سے دعوت کا جذبہ نکل گیا ہے اس لئے وہ طرح طرح کے عذر لنگ تراش کر کے اپنے آپ کو اس سے فارغ کئے ہوئے ہیں۔

الرسالہ پڑھنے والوں کو "ملیشیا" سے میری دل چسپی کا راز جاننا مشکل نہیں۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ملیشیا کا علاقہ اسلام کی دعوتی قوت کی ایک حیرت انگیز مثال ہے۔ اس علاقہ میں اسلام صرف اپنی دعوتی قوت کے ذریعہ پھیلا۔ یہاں کوئی بھی عسکری طاقت استعمال نہیں کی گئی۔ بلکہ تاریخ بتاتی ہے کہ اس علاقہ میں اسلام کی اشاعت مسلم تاجروں کے ذریعہ اس وقت ہوئی جب کہ اسلام کی عسکری قوت بالکل برباد ہو چکی تھی۔

ڈاکٹر آرنلڈ نے بجا طور پر لکھا ہے کہ اگرچہ بعد کے سالوں میں اسلام کی عظیم سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور اس کی سیاسی طاقت ختم ہو گئی تاہم اس کی روحانی فتوحات کسی وقفہ کے بغیر جاری رہیں۔ جب منگول قبائل نے ۱۲۵۸ء میں بغداد کو تباہ کر دیا اور عباسی مملکت کو خون میں ڈبو دیا۔ اور جب مسلمان ۱۲۳۶ء میں قرطبہ سے فرڈ نینڈ کے ہاتھوں نکال دئے گئے اور غرناطہ جو اسپین میں اسلام کا آخری مرکز تھا اس نے عیسائی بادشاہ کو خراج ادا کیا تو عین اس وقت اسلام سماترا میں داخل ہو چکا تھا اور جزائر ملایا میں اپنی فتوحات کا آغاز کر رہا تھا۔ اپنے سیاسی انحطاط کے زمانہ میں بھی اسلام نے شاندار روحانی ترقی حاصل کی ہے:

> Although in after years this great empire was split up and the political power of Islam diminished, still its spiritual conquests went on uninterruptedly. When the Mongol hordes sacked Baghdad (A.D. 1258) and drowned in blood the faded glory of the Abbasid dynasty — when the Muslims were expelled from Cordova by Ferdinand of Leon and Castile (A.D. 1236), and Granada, the last stronghold of Islam in Spain, paid tribute to the Christian king — Islam had just gained a footing in the island of Sumatra and was just about to commence its triumphant progress through the Island of the Malay Archipelago. In the hours of its political degradation, Islam has achieved some of its most brilliant spiritual conquests.
>
> T.W. Arnold, *The Preaching of Islam*, Lahore 1976 p. 2.

اگر آپ اسپین اور بغداد کا الگ الگ مطالعہ کریں اور ملیشیا کا الگ تو آپ کو اس میں کوئی سبق نہیں ملے گا۔ مگر جب دونوں کو ملا کر دیکھا جائے تو وہ عظیم سبق برآمد ہوتا ہے جس کی طرف اوپر کے اقتباس میں اشارہ کیا گیا ہے۔

جب میں ملیشیا کی طرف جا رہا تھا تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں کسی ملک کی طرف نہیں جا رہا ہوں بلکہ اسلام کی تاریخ کی طرف جا رہا ہوں۔ ایک ایسی تاریخ جو اہل اسلام کو یہ سبق دیتی ہے کہ اگر تمہارے پاس مادی اور عسکری طاقت موجود نہ ہو تب بھی تمہارے لئے مایوسی کا کوئی سوال نہیں۔ تم اپنی فکری اور روحانی طاقت کو استعمال کرکے ازسرنو اپنے لئے ایک نئی دنیا بنا سکتے ہو۔

۲۳ جولائی ۱۹۸۴ کو میں کوالالمپور کے لئے روانہ ہوا۔ روانگی کے وقت میرا جہاز رات کو ۲ بجے تھا۔ اسی طرح جب میں کوالالمپور سے واپس ہوا تو میں دوبارہ دہلی میں رات کے وقت اترا۔ جو لوگ باہر کی دنیا میں سفر کرتے رہتے ہیں انھیں اندازہ ہے کہ اس طرح غیر موزوں (Odd) اوقات میں سفر کرنے کا معاملہ زیادہ تر دہلی میں پیش آتا ہے۔ یہ دراصل ملک کی پس ماندگی کی قیمت ہے۔ دہلی کے ایک انگریزی اخبار نے پالم ہوائی اڈہ کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھا تھا:

> Palam airport's main problem is overcrowding during the night hours. There is a lull all day. This happens because many countries do not allow night landings in order to eliminate noise. India cannot afford to follow their example because it would lose much of the traffic it gets. There is, therefore, bunching of aircraft leading to congestion

پالم ایرپورٹ کا بنیادی مسئلہ رات کے اوقات میں غیر معمولی بھیڑ ہے۔ یہاں سارے دن سکون رہتا ہے۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ اکثر ممالک شور کو ختم کرنے کے لئے رات کو اپنے یہاں جہاز اترنے کی اجازت نہیں دیتے۔ ہندستان ایسی پابندی نہیں لگا سکتا۔ کیوں کہ اگر وہ ایسا کرے تو وہ اپنے اکثر مسافروں کو کھو دے گا۔ اس بنا پر یہاں رات کو جہازوں کی کثرت رہتی ہے جس کی وجہ سے یہاں رات کے اوقات میں بھیڑ بھاڑ رہتی ہے۔

اگر آپ قومی سطح پر پس ماندہ ہیں تو موجودہ مقابلہ کی دنیا میں بہرحال آپ کو اس کی قیمت دینی پڑے گی۔ اسباب کی اس دنیا میں اس سے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔

۲۳ جولائی ۱۹۸۴ کی رات کو ۲ بجے میں بھارتی ایرویز (فلائٹ ۳۰۴) کے ذریعہ دہلی سے روانہ ہوا۔ فرسٹ کلاس کے مسافروں کے لئے ہوائی کمپنیوں کا معاملہ اس قدر خصوصی ہوتا ہے کہ ان کے لئے بورڈنگ کارڈ بھی زیادہ شاندار کاغذ پر چھاپے جاتے ہیں۔ یہاں ہر چیز کا معیار اعلیٰ ہوتا ہے۔ ہر چیز

کا انداز عام اکانومی کلاس سے مختلف رکھا جاتا ہے۔ خصوصی تحفے بھی دئے جاتے ہیں۔

میں نے سوچا کہ دنیا کا موجودہ نظام بھی انسان کو کس قدر دھوکے میں ڈالنے والا ہے۔ دنیا میں یہ تمام فرق پیسہ کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ یہاں صرف پیسہ کی زیادتی اور کمی پر ایک شخص کو اونچا درجہ مل جاتا ہے اور دوسرے کو نیچا۔ اس سے انسان اس غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے کہ پیسہ ہی اس دنیا میں سب کچھ ہے۔ وہ اپنی پوری زندگی اور ساری طاقت صرف پیسہ کو حاصل کرنے میں لگا دیتا ہے۔ وہ اسی میں مصروف رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی موت آجاتی ہے۔ اس وقت اچانک اس کو معلوم ہوتا ہے کہ وسیع تر زندگی کے اعتبار سے یہاں پیسہ کی کوئی قیمت نہ تھی۔ یہ سوچ کر بے اختیار دل بھر آیا۔ میری زبان سے نکلا: کاش آج کے انسان کو بتایا جاسکے کہ زندگی کا اصل مسئلہ کیا ہے۔ اور اس کو چھوڑ کر وہ کس چیز کو اپنا مسئلہ بنائے ہوئے ہے۔ یہی اصل دعوتی کام ہے۔ مگر یہی وہ کام ہے جس کو کرنے والا آج کوئی نہیں۔

ایک دنیا وہ ہے جس کا نام "دہلی" ہے۔ دوسری دنیا وہ ہے جس کا نام "کوالالمپور" ہے۔ دونوں ہمارے معلوم دائرہ کے مقامات ہیں۔ ایک آدمی دہلی سے کوالالمپور جارہا ہو یا کوالالمپور سے دہلی آرہا ہو تو وہ جانتا ہے کہ وہ کہاں سے کہاں جارہا ہے۔ اس کو اپنے آغاز اور اپنے انجام کا پورا یقین ہوتا ہے۔ ایسا ہی کچھ معاملہ دنیا اور آخرت کا بھی ہے۔ ہر آدمی ایک مسافر ہے۔ ہر آدمی موجودہ دنیا سے آخرت کی دنیا کی طرف جارہا ہے۔ وہ ایک نظام سے دوسرے نظام کی طرف سفر کر رہا ہے۔ مگر کوئی نہیں جس کو اس واقعہ کا سچا یقین ہو۔ جو دوسرے سفر کا بھی اسی طرح زندہ احساس رکھتا ہو جس طرح وہ اپنے پہلے سفر کا زندہ احساس رکھتا ہے۔

بینکاک سے کوالالمپور جانے کے لئے دوسرا جہاز پکڑنا تھا۔ بینکاک کا ہوائی اڈہ دلی کے ہوائی اڈہ سے زیادہ باقاعدہ اور زیادہ منظم نظر آیا۔ میں کاؤنٹر پر گیا تاکہ تھائی ایر ویز کی اگلی فلائٹ (۴۱۵) کے لئے بورڈنگ کارڈ حاصل کروں۔ کاؤنٹر پر کھڑی ہوئی خاتون نے میرا ٹکٹ لیا اور کمپوٹر کی چند کنجیوں پر انگلی ماری اور اچانک میرے ٹکٹ اور رزرویشن کی پوری تفصیل اسکرین پر آگئی۔ موجودہ زمانہ میں کمپوٹر نے جو انقلاب برپا کیا ہے یہ اس کی ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ کمپوٹر گویا ایک قسم کا مشینی "حافظہ" ہے۔ آپ اس کے حافظہ میں بے شمار معلومات ڈال سکتے ہیں اور پھر ضرورت کے وقت بٹن دبانے پر ایک لمحہ میں وہ ساری معلومات سکرین پر نمایاں ہو کر آپ کے سامنے آجائیں گی۔

دوران پرواز ایر ہاسٹس ناشتہ کے لئے مختلف قسم کا سامان میز پر رکھ کر لے آئی۔ ان میں سے مجھے اپنے لئے انتخاب کرنا تھا۔ میں نے دیکھا تو اس میں زیادہ تر گوشت کی چیزیں تھیں یا مغربی طرز کے کھانے تھے۔

گوشت کے ساتھ حلال کا مسئلہ تھا اور مغربی طرز کے کھانے میرے ذوق کے مطابق نہیں۔ میز کے ایک طرف چاول نظر آیا۔ میں نے کہا یہ چاول دے دو۔ ایر ہاسٹس نے فوراً کہا:

It is ham-rice sir, do you take ham?

میں نے کہا کہ نہیں۔ پھر میں نے سوچا کہ ہیم (لحم خنزیر) کی اس دنیا میں اگر چاول بھی اس سے محفوظ نہیں تو آخر کیا چیز ہے جس کو یہاں کھایا جائے۔

چوں کہ بنکاک میں جہاز بدلتا ہے اس لئے جاتے اور آتے ہوئے کچھ اوقات بنکاک میں گزرے اس طرح تھائی لینڈ کو کسی قدر دیکھنے اور جاننے کا موقع ملا۔ تھائی لینڈ کی کل آبادی تقریباً ۴۵ ملین ہے۔ اس میں ۹۰ فی صد بدھسٹ ہیں۔ مسلمانوں کی تعداد تقریباً دو ملین (۲۰ لاکھ) ہے۔ وہ زیادہ تر تھائی لینڈ کے جنوبی حصہ میں بستے ہیں۔ یعنی لمبائی میں پھیلے ہوئے ملک کا وہ حصہ جو ملیشیا سے ملا ہوا ہے۔ یہ لوگ تھائی اور ملائی زبان بولتے ہیں۔

بنکاک سے مسلمانوں کے دو ماہنامے نکلتے ہیں۔ ایک الجہاد، دوسرا رابطہ۔ دونوں تھائی زبان میں ہیں۔ "الجہاد" کے اڈیٹر سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ دونوں ماہناموں کی تعداد اشاعت پانچ پانچ ہزار ہے۔ تھائی لینڈ میں تقریباً دو ہزار مسجدیں ہیں۔ یہاں کوئی بڑی اسلامی درس گاہ نہیں۔ البتہ چھوٹے چھوٹے مدرسے سیکڑوں کی تعداد میں ہیں۔ جنوبی تھائی لینڈ کے مسلمان ملائی زبان بولتے ہیں۔ شمالی تھائی لینڈ کے مسلمانوں کی زبان تھائی ہے۔ مگر مسلمانوں کا رسالہ یا کتابیں صرف تھائی زبان میں چھپتے ہیں۔ کیوں کہ تھائی لینڈ کے قانون کے مطابق صرف تین زبانوں میں کوئی چیز چھاپی جا سکتی ہے۔ تھائی، انگریزی، چینی۔ تاہم ملیشیا سے ملائی زبان کی کتابیں اور رسالے آتے رہتے ہیں۔ تھائی زبان کا رسم الخط ناگری سے ملتا جلتا ہے۔

تھائی قوم کی اصل چینی ہے۔ وہ غالباً بارھویں صدی عیسوی میں جنوبی چین سے آکر یہاں آباد ہوئے۔ یہاں عام طور پر تھائی زبان بولی جاتی ہے۔ دوسرے نمبر پر انگریزی زبان رائج ہے۔ آبادی کا ۷۰ فی صد حصہ چاول کی کاشت کرتا ہے۔ تھائی لینڈ دیہاتوں اور قصبات کا ایک ملک ہے۔ اس کا واحد بڑا شہر بنکاک ہے جو بین اقوامی گزرگاہ ہونے کی بنا پر کافی مشہور ہے۔ یہاں کا پہلا بادشاہ مینگرائی اعظم تھا۔ مختصر حکومت کے بعد ۱۳۴۵ء میں اس کا خاتمہ سادہ طور پر اس طرح ہوا کہ اس کو گھڑیال نے نگل لیا۔

تھائی لینڈ کے لفظی معنی ہیں "آزادی کا ملک"، یہاں کی زندگی اور رسم و رواج پر سب

سے زیادہ بدھزم کا اثر ہے جو بنیادی طور پر ایک روادار مذہب ہے۔ مزید یہ کہ تھائی لینڈ جنوب مشرقی ایشیا کا واحد ملک ہے جو نوآبادیاتی نظام کی ماتحتی سے بچا رہا۔ اس بنا پر یہاں غیر ملکی تہذیب کے خلاف نفرت اور تعصب کی وہ فضا نہیں ہے جو دوسرے ملکوں میں پائی جاتی ہے۔

ان اسباب نے تھائی لینڈ میں دعوت و تبلیغ کا میدان بہت بڑے پیمانہ پر کھول دیا ہے۔ مگر اس سے صرف عیسائی مبلغین فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ مسلمانوں نے ابھی تک یہاں دعوت و تبلیغ کے لئے کوئی قابل ذکر نظام نہیں بنایا۔

بینکاک سے کوالالمپور جاتے ہوئے راستہ میں انگریزی اخبار، بینکاک پوسٹ (۲۳ جولائی ۱۹۸۴) پڑھنے کو ملا۔ عجیب اتفاق کہ اس اخبار کے صفحہ اوّل کی پہلی سرخی جہاز کی تباہی (Plane crash) کی تھی۔ دو انجن کا یہ چارٹرڈ جہاز تھائی حکومت کے اعلیٰ افسروں کو لئے ہوئے اڑ رہا تھا۔ وہ ہوائی اڈہ سے صرف ۱۲ کیلومیٹر کے فاصلہ پر تھا کہ کنٹرول ٹاور کو اس کا پیغام ملا کہ ہمارے انجن میں خرابی آگئی ہے اور مجبوراً ہم دھان کے کھیت میں جہاز اتار رہے ہیں۔ اس کے بعد اچانک پیغام آنا بند ہو گیا۔ جہاز کھیت میں اتر رہا تھا کہ ٹکرا کر تباہ ہو گیا۔

ایک کسان جو اس منظر کو دیکھ رہا تھا اس نے کہا کہ میں نے دیکھا کہ جہاز ڈگمگاتے ہوئے نیچے آرہا ہے۔ اس کے بعد یکایک زور دار دھماکہ (Loud explosion) ہوا اور جہاز ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ خبر میں بتایا گیا تھا کہ مرنے والوں میں تھائی لینڈ کے منرل ریسورسز ڈپارٹمنٹ کے ڈائرکٹر بھی شامل تھے۔ کچھ لوگ شدید زخمی ہو کر اسپتال پہنچائے گئے اور وہاں جا کر مر گئے۔

یہ خبر میں نے ایسی حالت میں پڑھی کہ میں خود بھی ایک جہاز میں بیٹھا ہوا فضا میں اڑ رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے حادثہ خود میرے ساتھ گزر رہا ہو۔ زندگی اور موت ایک دوسرے سے بالکل قریب نظر آئے۔

زمینی سواری میں کوئی خرابی آجائے تو اس کو ٹھہرا کر درست کیا جا سکتا ہے۔ مگر اسی طرح آپ ہوائی جہاز کو فضا میں نہیں ٹھہرا سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاز میں کوئی خرابی آنے کا مطلب ہمیشہ حادثہ ہوتا ہے۔ جہاز اپنے مسافروں کے لئے گویا اڑتی ہوئی قبر ہے۔ کسی کی یہ قبر فضا میں بن جاتی ہے اور کسی کو جہاز اڑا کر تیزی سے وہاں پہنچا دیتا ہے جہاں اس کو عام قبر میں دفن کیا جا سکے۔

انسان کتنا زیادہ موت سے قریب ہے مگر وہ کتنا زیادہ اپنے آپ کو موت سے دور سمجھتا

ہے۔

کوالالمپور میں میرا قیام پہلے دن ہالی ڈے ان (Holiday Inn) میں کمرہ نمبر ۲۱۹ میں رہا۔ مجھے یہاں نماز پڑھنے کی ضرورت ہوئی۔ اس وقت اتفاق سے کوئی قبلہ کا رخ بتانے والا نہ تھا۔ تردد ہوا کہ کس طرف رخ کرکے نماز پڑھی جائے۔ اچانک میری نظر چھت کی طرف گئی تو چھت پر تیر کی شکل کا ایک کاغذ یا پلاسٹک کا ٹکڑا چپکا یا ہوا تھا جس پر انگریزی میں لکھا ہوا تھا "قبلہ" یہ تیر بتا رہا تھا کہ قبلہ کی سمت کدھر ہے۔ چنانچہ اطمینان سے اس رخ پر نماز ادا کی۔ تیر نے موجودہ زمانہ میں ہتھیار کی حیثیت سے اپنی قیمت کھو دی ہے مگر رخ کے نشان کے لئے اب بھی ساری دنیا میں اس کا کوئی بدل نہیں۔

ہوائی اڈہ سے ہوٹل آتے ہوئے جب ہم لوگ بازار سے گزرے تو سڑک کے دونوں طرف کی بڑی بڑی دکانوں پر ایسے سائن بورڈ لگے ہوئے تھے جن پر انگریزی کے ساتھ چینی زبان میں بھی دکان کا نام لکھا گیا تھا۔ میلوں تک یہی منظر تھا۔ میرے ساتھی (وزارت ثقافت کے سکریٹری) نے بتایا کہ جن جن بورڈوں پر چینی حروف میں لکھا ہوا ہے وہ چینیوں کی دکانیں ہیں۔ میں نے دیکھا تو اکثر بڑی دکانوں پر چینی حروف میں لکھا ہوا تھا۔

ملیشیا چھوٹی چھوٹی مسلم سلطنتوں کا مجموعہ ہے۔ اب بھی یہ تمام سلطان موجود ہیں مگر عملاً پارلیمنٹ کے ہاتھ میں سارا اقتدار ہے۔ ۱۹ ویں صدی میں ملیشیا (ملایا) برطانی اقتدار کے ماتحت آگیا۔ برطانیہ نے اپنے دور اقتدار میں کثرت سے چینی اور ہندستانی مزدور ملیشیا میں درآمد کئے۔ یہ لوگ یہاں اس لئے لائے گئے تھے کہ ٹن کی کانوں اور ربر کے باغوں میں کام کرسکیں جن کے مالک انگریز تھے۔ ٹن اور ربر اب بھی ملیشیا کے بنیادی ذرائع آمدنی ہیں۔

چینی دھیرے دھیرے یہاں کی تجارتوں میں داخل ہونا شروع ہوئے۔ یہاں تک کہ وہ ملیشیا کی اقتصادیات پر قابض ہوگئے۔ ملائی قوم زیادہ تر دیہاتوں میں آباد رہی۔ اور چینی شہروں پر چھا گئے۔ ملایا نے ۱۹۵۷ میں برطانیہ سے آزادی حاصل کی۔ اس درمیان میں سنگاپور میں چینیوں کی اکثریت ہوچکی تھی۔ ابتداءً سنگاپور فیڈریشن کے ماتحت ملیشیا سے وابستہ رہا۔ ۱۹۶۵ میں اس نے کامل آزادی حاصل کرلی۔

۲۴ جولائی کو دوپہر بعد ہمیں "انٹرنیشنل ہاؤس" میں لے جایا گیا۔ اور آئندہ یہیں پر کمرہ نمبر ۱۳۰۲ میں قیام رہا۔ انٹرنیشنل ہاؤس ایک بین اقوامی ترقیاتی مرکز

(Asia and Pacific De... کے تحت قائم کیا گیا ہے۔ ہالی ڈے اِن اگرچہ یہاں کا بڑا ہوٹل ہے مگر وہ شہر کے اندر واقع ہے۔ اس کے برعکس انٹرنیشنل ہاؤس شہر کے باہر پہاڑی کے دامن میں قائم کیا گیا ہے۔ یہاں چاروں طرف قدرت کے مناظر ہیں۔ نیز یہاں ہوٹل کے ماحول کے بجائے "علمی" ماحول ہے۔ یہاں ایک بڑی لائبریری بھی ہے۔ یہ دوسری جگہ مجھ کو زیادہ پسند آئی۔

ہالی ڈے اِن کی ایک سجی ہوئی نشست گاہ کے دروازہ پر جلی حرفوں میں یہ الفاظ لکھے ہوئے نظر آئے (Rama Rama) اس سے مجھے شبہہ ہوا کہ یہ شاید کوئی ہندو ہوٹل ہے۔ بعد کو میں نے ایک ملیشیائی سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس کے معنی ملائی زبان میں تتلی کے ہیں ـــــ تحقیق سے پہلے ایک چیز کچھ نظر آتی ہے اور تحقیق کے بعد کچھ بن جاتی ہے۔

سیمنار کی طرف سے ہم کو جو بیگ دیا گیا تھا، میں نے ایک ذمہ دار سے پوچھا کہ یہ ملیشیا کا بنا ہوا ہے یا باہر کے کسی ملک کا۔ انھوں نے بتایا کہ ملیشیا کا۔ میں نے دوبارہ پوچھا: مسلم کارخانہ کا یا چینی کارخانہ کا۔ انھوں نے مسکرا کر کہا " اگرچہ مجھے تعین کے ساتھ معلوم نہیں ہے۔ مگر یقین ہے کہ وہ چینی کارخانہ کا ہوگا۔ کیوں کہ میرے علم کے مطابق کوالالمپور میں مسلمانوں کا کوئی ایسا کارخانہ نہیں ہے جو ایسا بیگ سپلائی کر سکے "

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملیشیا کی موجودہ صورت حال کیا ہے۔ یہاں مسلمان ۵۰ فی صد ہیں۔ حکومت پر ان کا قبضہ ہے۔ مگر تجارتی اور اقتصادی سرگرمیوں کو زیادہ تر چینی کنٹرول کرتے ہیں۔

ہندستان میں مسلمانوں کو شکایت ہے کہ ان کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اکثریت ان کا استغلال کر رہی ہے۔ پھر ملیشیا کے بارہ میں وہ کیا کہیں گے جہاں حکومت ان کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے باوجود یہاں کی دولت کا بہت بڑا حصہ چینی اقلیت کے قبضہ میں ہے۔ حتی کہ وہ اپنی اقتصادی قوت کی بنا پر براہ راست یا بالواسطہ طور پر دوسرے شعبوں پر بھی گہرے طور پر انداز ہوتے ہیں۔

عجیب اتفاق ہے کہ جس دن میں کوالالمپور پہنچا ٹھیک اسی دن مسٹر یاسر عرفات بھی اپنے وفد کے ساتھ یہاں آئے۔ وہ اپنے مقرر پروگرام سے ۵ گھنٹے لیٹ کوالالمپور پہنچے۔ ۲۵ جولائی کا مقامی اخبار (New Straits Times) یاسر عرفات کی خبروں اور تصویروں سے بھرا ہوا تھا۔ یہاں کے وائس

مشہور اسٹیڈیم نگارا (Stadium Negara) میں ان کی تقریر ہوئی تو وسیع اسٹیڈیم انسانوں سے آخری حد تک بھرا ہوا تھا۔ ان کی تقریر کا خلاصہ اخبار کی اس سرخی میں تھا:

Our struggle will only end with victory

(ہماری جد وجہد صرف فتح پر ختم ہوگی) اخباری اطلاع کے مطابق انھوں نے عربی میں تقریر کی جس کا ساتھ ساتھ انگریزی میں ترجمہ کیا جا رہا تھا۔

انھوں نے فلسطین کے موجودہ مسئلہ کی تمام تر ذمہ داری امریکہ اور اسرائیل پر ڈالی۔ مگر سوال یہ ہے کہ قرآن میں صریح وعدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل کفر کو اللہ ایمان پر ہرگز غلبہ کا موقع نہیں دے گا۔ لن یجعل اللہ للکافرین علی المومنین سبیلا) پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ امریکہ اور اسرائیل تقریباً ۴۰ سال سے اس آیت کریمہ کی تردید کر رہے ہیں اور خدا کی نصرت ظاہر نہیں ہوتی۔

جہاں تک راقم الحروف کا خیال ہے، فلسطین کا مسئلہ مسلمانوں کی دینی غفلت کا نتیجہ ہے۔ خاتم النبیین کے ظہور سے پہلے فلسطین بنی اسرائیل کیلئے خدا کی علامت تھا۔ جب خدا ان سے خوش ہوتا تو ان کو فلسطین پر قبضہ دے دیتا اور جب خدا ان سے ناراض ہوتا تو فلسطین کو ان کے دشمنوں کے حوالے کر دیتا۔ یہی معاملہ اب مسلمانوں کے ساتھ ہے۔ فلسطین ایک حسی علامت ہے جس سے مسلمان اپنی اسلامیت کو ناپ سکتے ہیں۔ خدا جب جب مسلمانوں سے راضی رہا تو اس نے فلسطین کو ان کے قبضہ میں دے دیا۔ اور جب وہ ان سے ناراض ہوا تو اس کو ان سے چھین کر ان کے دشمنوں کے حوالے کر دیا۔ ماضی میں بھی ایسا ہو چکا ہے اور آج بھی ایسا ہو رہا ہے۔ اس لئے امریکہ اور اسرائیل کو برا بھلا کہنے کے بجائے ہمیں اپنا احتساب کرنا چاہئے۔ اپنی کمزوریوں کو دور کر کے اپنے آپ کو اس کا مستحق بنانا چاہئے کہ خدا دوبارہ فلسطین کو ہمارے حوالے کر دے۔

انٹرنیشنل ہاؤس میں ایک وسیع اور صاف ستھری لائبریری ہے اس سے بھی استفادہ کا موقع ملا۔ کراچی کے اخبار ڈان (۱۹ جولائی ۱۹۸۴ء) میں کشمیر کے سابق وزیر اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی وزارت کی منسوخی پر طویل نوٹ تھا۔ اس کو پولیٹیکل ڈراما قرار دیتے ہوئے اڈیٹر نے لکھا تھا:

The manner in which Dr Farooq Abdullah's rival, Dr. G.M. Shah, has been inducted into the Chief Ministership in Srinagar does not point to any deep commitment to democratic norms and principles, on the part of the Indian leadership.

ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے حریف ڈاکٹر جی ایم شاہ کو جس طرح سرینگر میں وزیر اعلیٰ بنایا گیا ہے اس سے ظاہر

نہیں ہوتا کہ ہندستان کی قیادت جمہوری اصولوں سے گہری وابستگی رکھتی ہے۔

اس کو پڑھتے ہوئے میرے دل نے کہا "دوسرے پر تبصرہ کرتے ہوئے ہر آدمی حد درجہ اصول پرست نظر آتا ہے۔ مگر جب خود اپنا معاملہ ہو تو وہ اصول پرستی کے بجائے مفاد پرستی کو اپنا دین بنا لیتا ہے۔ لوگوں کے اندر اتنی غیرت بھی نہیں کہ جس غلطی میں خود مبتلا ہیں اسی غلطی کے معاملہ میں دوسرے کے اوپر تنقید نہ کریں۔

یہاں ہوٹل میں صبح سویرے مقامی اخبار نیو اسٹریٹ ٹائمس (new Straits Times) کمرہ میں پہنچ جاتا تھا۔ ۲۴ جولائی ۱۹۸۴ کے اخبار میں سنگاپور کے ڈپٹی پریمیر مسٹر سناتھمی راجارتھنم (Sinnathamby Rajarathnam) کی ایک تقریر پڑھنے کو ملی۔ انھوں نے سنگاپوری باشندوں کی مادیت پر سخت تنقید کی تھی۔ انھوں نے کہا کہ سنگاپور کے آدمی نے دولت کو مذہب کا بدل بنا لیا ہے:

Money is his substitute for religion

یہ بات صرف سنگاپوریوں کے لئے نہیں ہے بلکہ آج دنیا بھر کے انسانوں کا یہی حال ہو رہا ہے۔ دولت ایک ذریعہ ہے مگر اس کو بذات خود مقصد سمجھ لیا گیا ہے۔

اس خبر کو پڑھنے کے بعد ایسا ہوا کہ یہاں کی وزارت مالیات نے ہم سب لوگوں کو ایک عالیشان ہوٹل میں ڈنر دیا۔ یہاں قدرت کا حسین منظر، ساز وسامان کی جگمگاہٹ، زرق برق کاروں کا ہجوم تھا۔ اس قسم کے مناظر کے درمیان بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہروں کو دیکھ کر میری سمجھ میں آیا کہ دولت کو مذہب کا قائم مقام بنانے کا سبب کیا ہے۔ وہ ہے موجودہ زمانہ میں دولت کے استعمال کی بڑھی ہوئی مدات۔ قدیم زمانہ میں جب جدید تمدنی لوازم نہیں پیدا ہوئے تھے، انسان کے لئے دولت کا مصرف بہت محدود تھا۔ آج بے شمار نئی نئی چیزوں کے ظہور نے دولت کے استعمال کی مدوں کو لا تمناہی طور پر بڑھا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے جس کی بنا پر ہر آدمی دولت کی طرف بھاگا چلا جا رہا ہے۔

لیکن اگر زندگی کی حقیقت کو سوچا جائے تو دولت بالکل بے قیمت نظر آئے گی۔ زندگی کی حقیقت موت ہے۔ اسی اخبار میں کئی موتوں کی خبر تھی۔ مثلاً تنگو اندیر اپترا (Tengku Inder Petra) جو ریاست کلنتن کے راجہ تھے وہ ۲۳ جولائی ۱۹۸۴ کو انتقال کر گئے جب کہ ان کی عمر ۷۲ سال تھی۔ جیسا کہ خبر میں بتایا گیا ہے، موصوف غیر معمولی صلاحیت کے آدمی تھے۔ چنانچہ ۱۹۷۴ میں وہ بزنس میں داخل ہوئے اور کئی بڑی بڑی تجارتوں کے مالک بن گئے۔ وہ فیبرولن گروپ کے وائس

پریسیڈنٹ تھے۔ ایرہیتم تن اور مال پترا کے بورڈ آف ڈاکٹرس میں شامل تھے۔ مگر وہ اپنی دولت کے درمیان ۲، سال سے زیادہ نہ رہ سکے۔

جو دولت اتنی کم مدت تک انسان کا ساتھ دے وہ کس قدر بے حقیقت ہے۔ مگر دنیا کی چمک دمک نے لوگوں کو اتنا خیرہ کر رکھا ہے کہ ہر آدمی اس پر ٹوٹ رہا ہے۔ ہر آدمی چاہتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اس کو اپنے لئے حاصل کرلے۔

باہر جب کسی شخص کو بلایا جاتا ہے تو قدرتی طور پر اس کے لئے ہر قسم کی سہولت کا اعلیٰ انتظام کیا جاتا ہے۔ مگر میرا یہ حال ہے کہ ہر سہولت جیسے مجھ کو کاٹتی ہے۔ جو لوگ مجھ کو جانتے ہیں انھیں معلوم ہے کہ مجھ کو سادگی میں راحت ملتی ہے نہ کہ تکلف میں۔

یہی وجہ ہے کہ بظاہر خواہ کتنی ہی سہولیات ہوں مگر مجھے باہر کے سفروں میں کبھی سکون نہیں ملتا۔ کوالالمپور کے لئے جو ٹکٹ آیا تھا اس میں انھوں نے بطور خود واپسی کا رزرویشن ۲ اگست کو کیا تھا۔ جب کہ روانگی کا رزرویشن ۲۳ جولائی کے لئے تھا۔ مجھے گھبراہٹ تھی کہ اتنے دنوں تک میں کیسے مصنوعی ماحول میں رہوں گا۔ چنانچہ میں نے کوالالمپور پہنچ کر سابقہ رزرویشن منسوخ کرادیا اور دوبارہ ۳۰ جولائی کے لئے واپسی کا رزرویشن کرایا۔

سیمنار کے ذمہ داروں کو معلوم ہوا تو انھوں نے سخت اختلاف کیا۔ وہ کسی طرح اس پر راضی نہ ہوئے۔ چنانچہ مجھ کو دوبارہ اسے ۲ اگست کا کرانا پڑا۔ اس سارے معاملہ کا سبب وہ اکتاہٹ تھی جو مجھے ہر سفر میں ہوتی ہے۔ ٹکٹ جب دوبارہ تبدیل ہو کر میرے ہاتھ میں آیا تو دل کی عجیب کیفیت ہوگئی۔ بے اختیار میری زبان سے نکلا: انسان آج اکتاہٹ کو بھی برداشت نہیں کرپاتا پھر کل وہ عذاب کو کیسے برداشت کرے گا۔

لندن سے ایک اعلیٰ معیار کا ماہنامہ نکلتا ہے جس کا نام ساؤتھ (South) ہے۔ ناشرین کے الفاظ میں یہ تیسری دنیا کا میگزین (The Third World Magazine) ہے۔ اس میں افریقہ اور ایشیا کے مختلف ممالک کا ماہانہ جائزہ ہوتا ہے۔ جولائی ۱۹۸۴ کے شمارہ میں ہندستان کے بارہ میں جو مضمون تھا اس کا خلاصہ میگزین کے اپنے الفاظ میں یہ تھا۔

> With the fires of Hindu-Muslim riots barely damped down in Bombay, the Sikhs of the Punjab prepared to face the final assault on the Golden Temple in Amritsar.

بمبئی میں ہندو مسلم فساد کی آگ ابھی مشکل سے بجھی تھی کہ پنجاب کے سکھوں کو امرت سر کے سورن مندر

پر آخری حملہ کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہونا پڑا۔

گویا ہندستان میں اس مدت میں جو قابل ذکر واقعہ ہوا وہ صرف مذکورہ بالا واقعہ تھا۔ موجودہ زمانہ کی صحافت اپنے تجارتی مقصد کے تحت انھیں واقعات کو نمایاں کرتی ہے جو سنسنی خیز ہوتے ہیں۔ یہ ہر ملک کی صحافت کا حال ہے۔ حالاں کہ واقعات کی اصل فہرست اس سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ جو شخص ملک کے اندر ان سنسنی خیز واقعات کو پڑھ رہا ہو وہ بھی اگرچہ اس سے گمراہ ہوتا ہے۔ مگر نسبتاً کم۔ کیوں خود واقعات کے درمیان ہونے کی بنا پر وہ دوسری قسم کے واقعات کا بھی تجربہ اور مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔ مگر جو شخص باہر کے ملک میں ہو اور جس کا ذریعہ صرف مذکورہ بالا قسم کی صحافت ہو وہ کسی ملک کے بارہ میں عجیب وغریب قسم کی رائے قائم کر لیتا ہے۔ جو سراسر غیر حقیقی اور مغالطہ آمیز ہوتی ہے۔

باہر کے ملکوں میں اپنے ملک کی خبر پڑھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم اپنے ملک کے بارہ میں نہیں پڑھ رہے ہیں بلکہ کسی اجنبی ملک کے بارہ میں پڑھ رہے ہیں۔ حیدر آباد کے فساد (جولائی ۱۹۸۴) کے موقع پر میں کوالالمپور میں تھا۔ وہاں کے اخبار نیو سنڈے ٹائمس (۲۹ جولائی ۱۹۸۴) میں بیرونی خبر رساں ایجنسی کے حوالے سے حیدر آباد کے فرقہ وارانہ فساد کی خبر چھپی۔ یہ خبر بجائے خود بھی مبالغہ آمیز تھی۔ مگر خبر کے ساتھ یہ الفاظ انتہائی حیرت انگیز تھے:

Hindus and Muslims have long had cultural and religous antagonisms. When the Muslims ruled India in the 10th and 18th centuries, they attempted to crush worship and culture, fuelling Hindu resentment.

(انڈیا کے) ہندو اور مسلم لمبے عرصہ سے ثقافتی اور مذہبی دشمنی میں مبتلا ہیں۔ جب ۱۰ ویں صدی اور اٹھارویں صدی کے درمیان ہندستان میں مسلمانوں کی حکومت تھی تو انھوں نے (ہندوؤں کے) مذہب اور ثقافت کو کچلنے کی کوشش کی۔ اس کی وجہ سے ہندوؤں میں ناراضگی کا جذبہ بھڑک اٹھا۔

جو لوگ اس قسم کی خبریں پڑھیں ان کا ذہن کس قدر غلط بنے گا۔ مگر اس کے لئے ہمیں خود اپنے آپ کو الزام دینا چاہئے نہ کہ دوسروں کو۔ اصل یہ ہے کہ مسلمان موجودہ زمانہ میں قدیم ذہن کے ساتھ داخل ہوئے۔ وہ زندگی کے صرف انھیں شعبوں سے آشنا تھے جو ہزاروں برس سے چلے آرہے تھے۔ نئے شعبوں سے وہ بالکل بے خبر رہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم شعبوں (مثلاً خطابت اور شاعری) میں انھوں نے بہت نام پیدا کیا۔ مگر جدید شعبوں کی اہمیت سے وہ اس قدر بے خبر تھے کہ وہ اس میں داخل بھی نہیں ہوئے۔ انھیں میں ایک خبر رسانی کا ادارہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں

چھ خبر رساں ادارے ہیں جو دنیا کی خبروں کا ۸۰ فی صد حصہ فراہم کرتے ہیں اور وہ سب کے سب یہودیوں کے ہیں یا عیسائیوں کے۔

۲۶ جولائی کو انٹرنیشنل ہاؤس کے بڑے ہال میں کارروائی شروع ہوئی۔ سیمینار کا افتتاح ملیشیا کے وزیر اعظم ڈاکٹر محمد (Dr Mahathir Bin Mohamad) نے کیا۔ انھوں نے اپنی تقریر ان الفاظ پر ختم کی:

The future of Muslim societies is with Islam.
Without Islam, they have no future.

مسلم اقوام کا مستقبل اسلام کے ساتھ ہے۔ اسلام کے بغیر ان کا کوئی مستقبل نہیں۔

یہ گویا "دکا نزہ" کا اجتماع تھا۔ تمام اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ ان کی اکثریت مغربی یونی ورسٹیوں کی تعلیم یافتہ تھی۔ طریق کار یہ تھا کہ مقالہ نگار اپنا مقالہ پڑھ کر سناتا یا اس کو سامنے رکھ کر اس کا خلاصہ بیان کرتا اور اس کے بعد حاضرین اس پر اظہار رائے کرتے۔ آخر میں وہ لوگوں کے تبصروں کا جواب دیتا۔ یہ سلسلہ ۲۶ جولائی کی شام سے ۳۱ جولائی کی صبح تک جاری رہا۔

آخر میں مختلف علمی شعبوں کے حلقے (ورک شاپ) قائم کئے گئے۔ ہر ایک گروہ نے الگ الگ کمرہ میں اپنے موضوع کو اسلامی بنانے کے بارہ میں بحث کی اور اپنی رپورٹ تیار کی۔ ورک شاپوں کی یہ رپورٹیں ۳۱ جولائی کی نشست میں پڑھی گئیں۔ پھر انسٹی ٹیوٹ کے صدر ڈاکٹر عبدالحمید ابوسلیمان کی اختتامی تقریر ہوئی۔ آخر میں ڈاکٹر احمد ذکی (امریکہ) کی دعا پر سیمینار کا خاتمہ ہوا۔

میں نے اس موقع پر جو مقالہ پیش کیا وہ انگریزی میں تھا۔ اس کا اردو خلاصہ انشاءاللہ الرسالہ کے آئندہ اڈیشن میں شائع کر دیا جائے گا۔

سیمینار کے سلسلے میں چند سبق آموز یادداشتیں یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

ڈاکٹر اسماعیل فاروقی نے اپنی انگریزی تقریر میں کہا کہ انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ کا آخری نشانہ کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے لئے مکمل نصاب بنانا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ دنیا بھر کے مسلم اسکالروں سے رابطہ قائم کر رہے ہیں۔ جن کی تعداد جلد ہی تقریباً ۳۰ ہزار ہو جائے گی۔

اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں کی مدد سے وہ جو کام کرنا چاہتے ہیں اس کے تین دور ہیں:

۱. مغربی علوم کی کامل مہارت (Mastery of western tradition of learning)

۲. اسلامی علوم کی کامل مہارت (Mastery of Islamic tradition of learning)

۳. تنقیدی جائزہ (Criticism)

۴. دونوں کے امتزاج سے صحیح اسلامی نصاب کی تیاری (Synthesis)

انھوں نے بتایا کہ اس وقت مختلف ملکوں کے نصف ملین مسلمان مغربی یونی ورسٹیوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ مسئلہ کتنا اہم ہے۔ پوری جدید نسل کا ذہن بگاڑا جا رہا ہے۔ اس کو درست کرنے کی واحد تدبیر یہ ہے کہ جدید معیار کے مطابق اعلیٰ نصاب تیار کیا جائے۔

سیمنار کے حاضرین نے اس تخیل کو بے حد پسند کیا۔ ایک صاحب نے فرمایا:

Idea of producing textbooks is absolutely a wonderful idea

تاہم ذاتی طور پر میں اس معاملہ میں پرجوش نہ ہو سکا۔ میرے نزدیک اولاً تو اس قسم کا نصاب بنانا ہی مشکل ہے۔ اور بالفرض اگر وہ بن جائے تو موجودہ حالت میں وہ رائج نہیں ہو سکتا۔ آج کی تعلیم گاہوں میں جو نصاب پڑھایا جاتا ہے وہ درحقیقت وقت کے غالب افکار کا انعکاس ہے۔ جب تک عالمی سطح پر ان افکار کا غلبہ ختم نہ کیا جائے، کوئی دوسرا نصاب جدید تعلیم گاہوں کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ اور بالفرض مسلمان خود اپنے تعلیمی ادارے بنا کر وہاں ان کتابوں کو پڑھائیں تو ایسی درس گاہوں کا وہی انجام ہوگا جو موجودہ زمانہ میں ان اسلامی مدرسوں کا نظر آتا ہے جن کے آگے ہم نے "جامعہ" کا بورڈ لگا رکھا ہے۔

بحث کے دوران ایک صاحب نے کہا کہ نصاب کے ساتھ ساتھ ہمیں اساتذہ بھی تیار کرنے ہوں گے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے مثال دی کہ سوڈیم اور کلورین دونوں الگ الگ زہر ہیں۔ مگر جب ان کو ملایا جاتا ہے تو ان کا مرکب (سوڈیم کلورائڈ) سادہ نمک بن جاتا ہے۔ اسکول کا استاد جب طالب علم کو یہ بتاتا ہے تو طالب علم پوچھتا ہے کہ ایسا کیوں کر ہوتا ہے۔ استاد اس کے جواب میں "نیچر" کا لفظ بول دیتا ہے۔ وہ مقام جہاں طالب علم کے ذہن میں "خدا" کا تصور ڈالا جا سکتا تھا۔ وہاں غلط استاد اس کے ذہن میں "نیچر" کو ڈال دیتا ہے۔ یہ عمل جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ طالب علم سمجھ لیتا ہے کہ سب کچھ نیچر کر رہی ہے۔ تقلیدی طور پر اگر وہ خدا کو مانے تب بھی اس کا اصل ذہن غیر خدا والا بن جاتا ہے۔

ایک صاحب نے گفتگو کے دوران حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا یہ قول نقل کیا: لن یسأل الجھلاء لِمَ لَمْ یتعلّموا ولکن یُسأل العلماء لِمَ لَمْ یعلّموا (نہج البلاغۃ)

جاہلوں سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ انھوں نے سیکھا کیوں نہیں۔ بلکہ عالموں سے یہ پوچھا جائے گا کہ انھوں نے سکھایا کیوں نہیں۔

اس قسم کے اقوال کو عام طور پر لوگ مسلمانوں اور مسلمانوں کے درمیان کا مسئلہ سمجھتے ہیں ۔ حالاں کہ وہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کا مسئلہ بھی ہے۔ جو لوگ سچائی سے بے خبر ہیں ان سے زیادہ ذمہ داری ان لوگوں کی ہے جو سچائی سے باخبر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی یہی غفلت ہے جس نے انھیں اللہ کی مدد سے محروم کر رکھا ہے۔ جب تک مسلمان بے خبروں کو باخبر کرنے کے لئے نہ اٹھیں گے وہ خدا کی مدد کے حق دار نہیں بن سکتے۔

۲۷ جولائی کو ڈاکٹر روزے گارودی کا مقالہ تھا۔ انھوں نے اپنا مقالہ فرانسیسی زبان میں لکھا تھا جو ان کی مادری زبان ہے۔ اس کا مقالہ ترجمہ کو الاپور میں انگریزی میں کرایا گیا۔ یہی انگریزی مقالہ انھوں نے پڑھ کر سنایا۔ آج ہال سب سے زیادہ بھرا ہوا تھا۔ ڈاکٹر گارودی کے مقالہ کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام اور عقل میں کوئی حقیقی ٹکراؤ نہیں۔ یہ پہلے بھی مصنوعی تھا اور آج بھی مصنوعی ہے۔ لوگ بطور خود کچھ نظریات بناتے ہیں اور ان کو اسلامی کہہ کر پیش کرتے ہیں اس سے عقل اور اسلام کے درمیان مصنوعی ٹکراؤ کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔

It arises artificial conflict between reason and Islam

ڈاکٹر گارودی نے کہا کہ اسلام کو زندہ کرنے لئے ضرورت ہے کہ قرطبہ یونی ورسٹی کو دوبارہ زندہ کیا جائے۔ انھوں نے مزید بتایا کہ اسپین میں دوبارہ اسلام پھیل رہا ہے۔ اسپینی نوجوان اسلام قبول کر رہے ہیں۔ وہاں ایسے لوگ پیدا ہو رہے ہیں جو "اسلام کو اسپینی تاریخ کا لاینفک جزء" قرار دیتے ہیں۔ ایک اسپینی نومسلم نے کہا "بہت جلد قرطبہ میں مسلمانوں کی تعداد خلافت کے زمانہ سے بھی زیادہ ہو جائے گی"

ڈاکٹر روزے گارودی (پیدائش ۱۹۱۳) فرانس کے کمونسٹ لیڈروں میں سے تھے۔

Dr. Roger Garaudy
18-A, Av. du Boucht, 1209 Geneve, Switzerland

انھوں نے ۱۹۸۲ میں اسلام قبول کر لیا۔ ان سے سیمنار کے دوران ملاقاتیں ہوئیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کے اسلام قبول کرنیکا سبب کیا تھا انھوں نے کہا کہ یہ میرے لئے کوئی اچانک فیصلہ نہیں تھا۔ میں نے اسلامی کلچر پر اپنی پہلی کتاب ۱۹۴۶ میں لکھی تھی۔ یہ کتاب اولاً فرانسیسی

ہیں اور اس کے بعد عربی میں شائع ہوئی۔ ان کے اپنے الفاظ ہیں، اسلام میرے لئے تبدیلی مذہب نہیں تھا بلکہ وہ میرے لئے تکمیل تھا:

I accepted Islam not as a rupture but as an accomplishment

میں نے مزید پوچھا کہ اسلام کے کس خاص پہلو نے آپ کو متاثر کیا۔ ان کا جواب تھا کہ اس کے ثقافتی پہلو (Cultural aspect) نے۔

لسانیات (Linguistics) کی بحث کے دوران ایک صاحب نے کہا کہ عرب آج قرآن کی زبان نہیں بولتے۔ اس کے جواب میں ایک عرب عالم نے بجا طور پر کہا کہ یہ صحیح ہے کہ عرب ممالک میں کئی لہجے رائج ہیں۔ مگر عوامی زبان میں دوسرے ملکوں میں بھی یہ فرق پایا جاتا ہے۔ جہاں تک علمی عربی کا تعلق ہے اس میں یہ فرق موجود نہیں۔ آج بھی عرب کے اجتماعات میں، ان کی ریڈیو اور ٹیلی وژن کی نشریات میں یا کتابوں میں وہی زبان ہوتی ہے جو قرآن کی زبان ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ کسی زبان کو جاننے کے لئے اس کے اسلوب کو جاننا ضروری ہے۔ مثلاً عربی گرامر کے ماہرین ہمیشہ یہ لکھتے ہیں کہ صیغة الامر (افعل) تفید الوجوب۔ امر کا صیغہ وجوب کا معنی رکھتا ہے۔ مگر اس کو مطلق معنی میں لینا درست نہیں۔ اگر اس کو مطلق وجوب کے معنی میں لے لیا جائے تو عجیب صورت پیدا ہو جائے گی۔ مثلاً قرآن میں ہے واذا حللتم فاصطادوا یہاں فاصطادوا امر کا صیغہ ہے۔ اب اگر اس کو نحوی تعریف کے معنی میں لے لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ احرام کھولنے کے بعد ضرور شکار کرو۔ حالاں کہ آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ یہاں امر کا صیغہ صرف اباحت کے معنی میں ہے۔ نہ کہ وجوب کے معنی میں۔ اسی طرح مثلاً اعملوا ما شئتم۔ وغیرہ۔

ایک صاحب نے بتایا کہ کسی زبان کے بارہ میں رائے قائم کرنے کے لئے اس کو مجموعی طور پر دیکھنا چاہئے نہ کہ کسی جزئی پہلو کی بنا پر رائے قائم کرلی جائے۔ مثلاً اسکیمو کی زبان میں برف کے لئے پچاس الفاظ ہیں۔ جب کہ کسی اور زبان میں برف کے لئے اتنے الفاظ موجود نہیں۔ مگر یہ معیار درست نہیں۔ اسکیمو چوں کہ برفانی علاقوں میں رہتے ہیں اس لئے برف کے بارہ میں ان کے یہاں مختلف الفاظ ہیں۔ مگر دوسرے اعتبارات سے ان کی زبان انتہائی ابتدائی اور معمولی ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ کوئی کام کرنے والی طاقت اصلاً انسان ہے نہ کہ کوئی نظام۔

انھوں نے مثال دی کہ عبرانی زبان سیکڑوں سال سے مردہ زبان تھی۔ اسرائیل بننے کے بعد ایک یہودی عالم اسرائیل آیا۔ وہ اور اس کا خاندان عبرانی زبان بولتا تھا۔ اس نے کہا کہ میں اسرائیل کی زبان عبرانی بناؤں گا۔ لوگوں نے اس کو ناقابل عمل سمجھا۔ بہتوں نے اس کو پاگل کہا۔ ایک یہودی عالم نے کہا کہ زبان کی مثال گلاس کی سی ہے۔ گلاس ٹوٹ جائے تو اس کو دوبارہ جوڑا نہیں جاسکتا۔ اسی طرح زبان ایک بار ختم ہوجائے تو اس کو دوبارہ زندہ نہیں کیا جاسکتا۔ مگر مذکورہ یہودی نے جنونانہ طور پر اپنی کوشش جاری رکھی۔ یہاں تک کہ آج عبرانی اتنی ترقی کرچکی ہے کہ وہ اسرائیل کی سرکاری زبان ہے۔ اس نے ٹوٹے ہوئے گلاس کو دوبارہ جوڑ دیا۔

ایک صاحب نے یہ نظریہ پیش کیا کہ انسان پیدائشی طور پر بالکل بے علم اور بے خبر ہوتا ہے۔ اس کا سارا علم خارج سے حاصل شدہ علم ہوتا ہے۔ اس کی تائید میں انھوں نے قرآن کی یہ آیت پڑھی:

واللہ اخرجکم من بطون امھاتکم لا تعلمون شیئاً۔۔ النحل ۷۸

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر آدمی کوئی نظریہ قائم کرے اور اس کی تائید میں ایک آیت پیش کردے تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس کی بات قرآن سے ثابت ہوگئی ہے۔ کیوں قرآن میں اگر مذکورہ بالا آیت ہے تو اسی کے ساتھ اس میں دوسری آیات بھی ہیں مثلاً:

وعلم آدم الاسماء کلھا

فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا

پہلی آیت کے ظاہری الفاظ سے اگر یہ نکلتا ہے کہ آدمی بے علم حالت میں پیدا ہوتا ہے تو دوسری آیات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کو علم اسماء دیا گیا ہے۔ اس کی فطرت میں کچھ باتوں کا علم پیدائشی طور پر پیوست کردیا گیا ہے۔ قرآن کے نظریۂ علم کو سمجھنے کے لئے دونوں قسم کی آیتوں کو سامنے رکھ کر رائے قائم کرنی پڑے گی۔

پاکستان کے ایک صاحب سے گفتگو ہوئی۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہم لوگ نہ اِدھر کے رہے اور نہ ادھر کے رہے۔ پاکستان میں ہم کو دوسرے درجہ کا شہری سمجھا جاتا ہے۔ ان کے الفاظ یہ تھے:

We are not the sons of soil, so we are treated as second class citizens

ان کے بیان کے مطابق سرکاری ملازمتوں وغیرہ میں مہاجرین کے ساتھ سخت امتیاز کیا جاتا ہے۔ اگر ان کا کہنا صحیح ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان میں بھی وہی صورت حال مختلف شکل میں موجود ہے جس کی ہندستان کے مسلمان اپنے بارہ میں شکایت کرتے ہیں۔ کیسی عجیب تھی "تقسیم" کی سیاست جس نے ایک ملک کے مسلمانوں کو تین ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا اور تینوں میں سے کسی کو کچھ نہیں دیا۔ البتہ ہر ایک سے کچھ نہ کچھ چھین لیا۔

مگر اس سیاست کی ذمہ داری انگریزوں پر یا مسٹر جناح پر ڈالنا بدترین کمینگی ہے۔ یہ اپنے قصور کے لئے دوسرے کو ملزم ٹھہرانا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر جناح یا انگریز نے مسلمانوں کو غلط رخ کی طرف پکارا تو مسلمان اس کی طرف دوڑ کیوں پڑے۔ چنانچہ آج بھی قوم کا حال یہی ہے۔ آج بھی اگر کوئی اللہ کا بندہ مسلمانوں کو حقیقت پسندی کی طرف بلائے تو وہ اس کی آواز کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اور دوبارہ جناح جیسی آوازوں کیطرف دوڑ رہے ہیں۔ آہ وہ لوگ جن کا حال اس آیت کا مصداق بن جائے:

وان یروا سبیل الغی یتخذوہ سبیلا وان یروا سبیل الرشد لا یتخذوہ سبیلا

ایک خاتون نے آرٹ کو اسلامی بنانے کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ مقالہ کافی معلوماتی اور دلچسپ تھا۔ انھوں نے مزید کہا کہ اسلام موسیقی (Sound art) کو تسلیم کرتا ہے اور اس کی مثال خود قرآن ہے:

Qur'an is a sound art par excellence

ہر مسلمان قرآن کو ساؤنڈ آرٹ کے ساتھ روزانہ صبح کو دہراتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن کی آواز میں ایک حسن ہے۔ مگر اس خصوصیت کو فن کی حیثیت دینا غالباً اس قیمت پر ہوگا کہ "تدبر" کا پہلو اوجھل ہو جائے جو کہ قرآن کی اصل حیثیت ہے۔ اس کی مثال موجودہ زمانہ میں تجوید کا وہ فن ہے جس نے قرآن کی تلاوت کو ایک قسم کا آرٹ بنا کر تدبر کے پہلو کو مجروح کر دیا ہے۔

جو "دکانرہ" اس انٹرنیشنل سیمنار میں شریک تھے ان میں بڑی تعداد ان افراد کی تھی جو اپنے ملک میں اپنی قومی حکومت کے ظلم کا شکار ہوئے۔ اس کے بعد اپنے ملک میں حالات ناساعد پاکر وہ مختلف بیرونی ملکوں میں چلے گئے۔ انھیں میں سے ایک تعداد یورپ یا امریکہ پہنچ گئی۔ ان لوگوں کے لئے چوں کہ ذاتی محنت کے سوا کوئی اور سہارا باقی نہ تھا انھوں نے محنت شروع کر دی۔

وہ تعلیم میں آگے بڑھنے لگے۔ یہاں تک کہ اعلیٰ تعلیم کی آخری منزل پر پہنچ گئے۔ اس طرح ان لوگوں کی زندگیاں یہ سبق دے رہی ہیں کہ محرومی میں بھی کامیابی کا راز چھپا ہوا ہوتا ہے۔ مگر ان میں بہت کم ایسے لوگ ہیں جو امت کے مسائل پر بات کرتے ہوئے اس حقیقت کو امت کے وسیع تر مسائل میں بھی منطبق کرنے کا شعور رکھتے ہوں۔

ڈائننگ ہال میں جو لڑکے اور لڑکیاں کام کر رہی تھیں ان میں ایک لڑکا بہت مستعد اور فعال نظر آتا تھا۔ ایک روز میں نے اس کا نام پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ عیسائی ہے ——— دوسری قوموں کا یہ حال ہے کہ اگر ان کا کوئی فرد کہیں اقلیت میں ہو تو وہ زیادہ چوکنا رہتا ہے اور زیادہ محنت کرتا ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ وہ اپنی "کمی" کی تلافی زیادہ محنت ہی کے ذریعہ کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس ہندستان کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ہندستان میں ان کا اقلیت میں ہونا ان کو صرف ایک سبق دے رہا ہے۔ لا متناہی طور پر احتجاج اور شکایت میں مبتلا رہنا۔

مجھے کئی بار یہ تجربہ ہوا کہ جب میں گفتگو میں یا تقریر میں کہتا ہوں کہ "میرا خیال یہ ہے" تو اردو کے ماحول میں اس کو انا کے اظہار کے معنی میں لے لیا جاتا ہے۔ مگر انگریزی زبان میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ چنانچہ یہاں ہر آدمی جب کوئی رائے پیش کرتا ہے تو وہ کہتا ہے:

To my mind ....
It seems to me that ......

اس طرح کے الفاظ انگریزی میں بات کو گھٹا کر کہنے کے ہم معنی ہیں اور اردو میں بڑھا کر کہنے کے ایک جگہ وہ تواضع کا مفہوم رکھتے ہیں اور دوسری جگہ انانیت کا۔ کیسا عجیب فرق ہے ایک زبان میں اور دوسری زبان میں۔

۲۷ جولائی کو جمعہ کا دن تھا۔ ذمہ داروں نے پروگرام بنایا کہ میں کوالالمپور کی جامع مسجد میں نماز پڑھاؤں اور خطبہ دوں۔ میں نے اس سے انکار کیا۔ البتہ اسی مسجد میں جمعہ پڑھا جو یہاں کی قدیم ترین مسجد ہے۔

ہم مسجد میں پہنچے تو گیٹ پر ایک بورڈ پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ اوپر "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" عربی میں تھا اور نیچے انگریزی عبارت دکھائی دیتی تھی۔ میں قریب گیا تو معلوم ہوا کہ انگریزی رسم الخط میں ملائی زبان ہے۔ ۱۹۷۵ کے سرکاری فیصلہ کے مطابق ملائی زبان کو رومن رسم الخط میں لکھا جاتا ہے۔ مثلاً عید الفطر کو یہ لوگ اپنی زبان میں (Aidilfi tri) لکھتے ہیں۔ خوش آمدید کو (Selamat Datang) سرکاری

کام اور دوسرا زیادہ تر کام رومن رسم الخط میں انجام دیا جاتا ہے۔ تاہم ایک طبقہ ابھی تک ایسا موجود ہے جو قدیم رسم الخط کو استعمال کرتا ہے جو عربی سے ملتا جلتا ہے۔ اب دوبارہ تحریک چل رہی ہے کہ رومن رسم الخط کو ترک کرکے سابق رسم الخط کو ازسرنو اختیار کرلیا جائے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی پس ماندگی کا ایک سبب یہ بھی ہے۔ وہ کسی معاملہ میں ایسا فیصلہ نہیں کر پاتے جوان کے درمیان نسل درنسل چلے۔ ایک حکمراں ہنگامہ خیز عمل سے گزر کر ایک دستور بناتا ہے۔ اور اگلا حکمراں اس کو بدل دیتا ہے۔ ایک قائد مسلمانوں کو ایک رخ پر دوڑاتا ہے۔ اگلا قائد آکر دوبارہ دوسرے رخ پر دوڑانا شروع کرتا ہے۔ اس کی وجہ سے مسلمان ابھی تک درمیانی راستہ میں ہیں۔ وہ منزل تک نہیں پہنچ سکے۔

جامع مسجد کا طرز تعمیر ہندستان کی مساجد سے بالکل مختلف تھا۔ مسجد نہایت صاف ستھری دکھائی دی۔ اس مسجد کی ایک بات مجھے بہت پسند آئی۔ ہندستان کی اکثر مسجدوں میں یہ منظر دکھائی دیتا ہے کہ جمعہ کے دن لوگ صفوں میں ہیں۔ کوئی سنت پڑھ رہا ہے۔ کوئی ذکر کر رہا ہے اور دو آدمی ان کے درمیان کپڑا پھیلائے ہوئے ادھر سے ادھر سے گزر رہے ہیں اور مسجد کا چندہ مانگ رہے ہیں۔ یہ منظر نمازیوں کے لئے بہت ناخوش گوار ہوتا ہے اور نماز کا احترام بھی اس کی وجہ سے مجروح ہوتا ہے عرب ملکوں میں چونکہ حکومت کا محکمہ اوقاف مساجد کی تمام ضرورتوں کا کفیل ہوتا ہے۔ اس لئے وہاں اس کا مسئلہ نہیں۔

مسجد جامع کوالالمپور میں مجھے اس کا بہترین حل نظر آیا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ اٹیچی کے بقدر ایک چھوٹا سا خوبصورت بکس ہے۔ جس میں اندرونی تالا بند ہے۔ اور اوپر ایک سوراخ بنا ہوا ہے۔ اس بکس کے نیچے جدید قسم کا عمدہ پہیہ لگا ہوا ہے۔ یہ بکس صفوں کے درمیان ایک کے بعد ایک گھومتا رہتا ہے۔ تقریباً ہر آدمی اس میں کچھ نہ کچھ ڈالتا ہے۔ ایک آدمی جب اپنی رقم ڈال چکتا ہے تو وہ بکس کو آگے دھکیل دیتا ہے۔ دوسرا آدمی اپنی رقم ڈال کر دوبارہ بکس کو آگے کر دیتا ہے۔ اس طرح بکس ایک کے بعد ایک تمام صفوں کے سامنے سے گزرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ پوری مسجد کا چکر لگا لیتا ہے۔

انٹرنیشنل ہاؤس کی چودہ منزلہ بلڈنگ میں تیسری منزل پر ایک بڑے کمرہ میں نماز باجماعت کا انتظام تھا۔ فجر کے وقت میں وہاں پہنچا تو ایک صاحب کھڑے ہوئے اذان دے رہے تھے۔ ان کا داہنا ہاتھ کان پر تھا اور بایاں ہاتھ لٹک رہا تھا۔ حی علی الصلوٰۃ اور حی علی الفلاح پر انھوں نے دائیں یا بائیں رخ نہیں کیا۔ بلکہ سامنے کی طرف رخ کئے ہوئے پوری اذان دیتے رہے۔

اگلے دن ایک اور صاحب نے اذان دی اور وہ اپنا دونوں ہاتھ لٹکائے رہے۔ انھوں نے ایک حی علے الصلوٰۃ پر دائیں طرف چہرہ کیا اور دوسری حیّ علے الصلوٰۃ پر بائیں طرف۔ اسی طرح حی علے الفلاح پر بھی۔ اسی طرح نماز کی ادائگی میں بھی مختلف قسم کے فرق نظر آتے ہیں۔ یہ فقہی مسالک کا فرق ہے۔ ہندستان میں ان معاملات میں اس قدر شدت ہے کہ مذکورہ بالاطرز پر کسی کو اذان دیتے دیکھیں تو اس کو مسجد سے نکال دیں۔ مگر یہاں ان معاملات میں کوئی شدت نہیں۔

میں نے اپنی کتاب (تجدید دین) میں اس کی حمایت کی تھی کہ فقہی مسائل میں شدّت کے بجائے توسع کا طریقہ اختیار کیا جائے تو یہاں ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ لوگوں نے عجیب عجیب خود ساختہ مطلب نکال کر اس کتاب کو بدنام کیا۔ حالاں کہ یہی لوگ جب باہر کے ملکوں میں جاتے ہیں تو اس قسم کے فروق کو خندہ پیشانی کیساتھ برداشت کرتے ہیں۔ وہاں ماحول کے دباؤ سے ہر آدمی وہی بات مان لیتا ہے جس کو دلیل کی بنیاد پر وہ اپنے ملک میں ماننے کے لئے تیار نہیں۔

ڈاکٹر مہدی گلشنی سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایران سے آئے تھے ان سے کافی باتیں ہوئیں وہ تہران یونی ورسٹی کے شعبہ سائنس میں پروفیسر ہیں۔ اور تعلیم کے تحت ساڑھے دس برس امریکہ میں رہ چکے ہیں۔ ان سے میں نے پوچھا کہ امریکہ میں آپ نے جو کچھ دیکھا اس میں کیا اچھی چیز تھی اور کیا بری چیز تھی۔ اچھی چیز ان کے الفاظ میں یہ تھی کہ وہ لوگ ہمیشہ بنیادی چیزوں (Basic things) پر متوجہ رہتے ہیں ہے اور معمولی چیزوں (Minor things) کو ہمیشہ نظر انداز کرتے ہیں۔ مسلم قوموں میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ وہ زیادہ تر معمولی چیزوں میں الجھے رہتے ہیں۔ اور بڑی بڑی چیزیں اکثر ان کی توجہ کا مرکز نہیں بن پاتیں۔

مغرب کی بری چیز کے سلسلے میں انھوں نے میٹریلزم (مادیت) کا نام لیا۔ انھوں نے کہا کہ ان کی سوچ اور ان کی دوڑ دھوپ کا مرکز و محور صرف مادی چیزیں ہوتی ہیں۔ اس سے اوپر اٹھ کر وہ سوچ نہیں پاتے۔

ڈاکٹر مہدی گلشنی نے ایران کے حالات کے ذیل میں بتایا کہ شاہ ایران رضا شاہ پہلوی نے ۱۹۷۸ میں ایک امریکی مجلہ (ورلڈ میگزین) کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ:

With an army of 700,00 nobody can overthrow me.

یعنی میرے پاس سات لاکھ فوج ہے۔ کوئی مجھے ایران کے تخت سے بے دخل نہیں کر سکتا۔ اس انٹرویو کے ایک سال بعد فروری ۱۹۷۹ میں شاہ ایران کو نہایت بے دردی کے ساتھ

تخت سے بے دخل کر دیا گیا۔ جب کہ فوج آخر وقت تک شاہ کی وفادار بنی ہوئی تھی۔

ایک گفتگو کے موقع پر ایک صاحب نے سوال کیا کہ جدید معلومات کی روشنی میں قرآن کی نئی تفسیر کرنا جائز ہے یا نہیں۔ کیوں کہ صحابہ و تابعین کو سارے قرآن کا علم تھا۔ اس لئے وہ جو کچھ تفسیر کر گئے ہیں وہی کافی ہونا چاہئے۔ ایک سعودی عالم نے اس کے جواب میں کہا کہ جدید تفسیر کے لئے خود صحابی کا اجازت نامہ حاصل ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن عباس جو حبرالامۃ کہے جاتے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ : القرآن یُفسرہ الزمان۔ یعنی زمانہ قرآن کی مزید تفسیر کرتا رہے گا۔ گویا قرآن کی تفسیر ختم نہیں ہوگئی۔ بلکہ علم کی ترقی کے ساتھ برابر جاری رہے گی۔

ایک مصری ڈیلی گیٹ نے اپنا ذاتی مشاہدہ بتایا کہ جمال عبدالناصر کو جب مصر میں اقتدار ملا تو شروع میں لوگوں نے ان کی زبان سے خوب اسلامی باتیں سنیں۔ حتی کہ انھوں نے بتایا کہ میں نے ایک تقریر میں جمال عبدالناصر کی زبان سے یہ الفاظ سنے ہیں :

ایھا الناس لا تکونوا ابناء الدنیا وتکونوا ابناء الآخرۃ

یہ واقعہ بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ کوئی سیاست داں اگر اسلامی باتیں کرے تو اس کو بہت زیادہ سنجیدہ نہیں سمجھنا چاہئے۔ کیوں کہ اس کو اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے عوام کو ساتھ لینا ہوتا ہے۔ اور عوام کو ساتھ لینے کی سب سے آسان تدبیر یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے دینی باتیں کی جائیں۔ یہ ظاہر کیا جائے کہ اس کی حکومت اسلام لانا چاہتی ہے۔ گویا مسلم ملک کے ڈکٹیٹر ٹھیک اسی طرح اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کے لئے اسلام کا نعرہ لگاتے ہیں جس طرح غیر مسلم ملک کے ڈکٹیٹر اسی مقصد کے لئے سوشلزم اور قومی اتحاد کے نعرے استعمال کرتے ہیں۔

کوالالمپور میں روزانہ شام کو کسی نہ کسی منسٹری کی طرف سے کسی عالی شان ہوٹل میں کھانا ہوتا تھا جو میرے لئے سخت وحشت ناک تھا۔ میرے نزدیک اس قسم کی دعوتیں صرف پیسہ اور وقت کا ضیاع ہیں۔ تاہم نظم کی پابندی میں ان میں شرکت کرنی پڑتی تھی۔ البتہ اس میں ۳۰ جولائی کے کھانے کا استثناء تھا۔

۳۰ جولائی کی شام کا کھانا وزیر اعظم کی سرکاری رہائش گاہ پر تھا۔ یہ سادہ قسم کی رہائش گاہ ابھی حال میں بنائی گئی ہے۔ تمام لوگ مغرب سے پہلے وہاں پہنچا دئے گئے۔ ایک بڑے ہال کو مکمل طور پر خالی کر کے مسجد کی مانند بنا دیا گیا تھا۔ ایک عرب (ڈاکٹر احمد ذکی) نے امامت کی۔ تقریباً ۰۰

مقتدیوں میں وزیر اعظم بھی شریک تھے۔ امام نے پہلی رکعت میں یہ آیت پڑھی :

یا داؤد انا جعلناك خلیفة فی الارض فاحکم بین الناس بالحق ... النحل ۲۶

اس وقت ایسا معلوم ہوا جیسے "مذہب" امامت کے مقام پر ہے اور وقت کا "حکمراں" اس کے پیچھے کھڑا ہوا احکام خداوندی کو سن رہا ہے۔ یہ واقعہ تھوڑی دیر کے لئے میری نظر میں مستقبل کی تمثیل بن گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں آئندہ آنے والے اس دور کی تصویر دیکھ رہا ہوں جس کی پیشین گوئی احادیث میں وارد ہوئی ہے۔

نماز کے بعد حاضرین کی طرف سے چند تقریریں ہوئیں۔ آخر میں وزیر اعظم ڈاکٹر محمد (Dr Mahathir Mohammad) نے مختصر تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ دوسروں کے ہاتھوں مسلمانوں کو جو نقصان پہنچ رہا ہے اس سے کہیں زیادہ وہ نقصان ہے جو خود مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کو پہنچ رہا ہے۔ انھوں اپنی تقریر میں کہا کہ ہم اپنے مسائل کے لئے دوسروں کو الزام نہیں دے سکتے۔ ہمیں خود اپنے آپ کو ذمہ دار ٹھہرانا ہوگا :

We cannot blame others. We have ourselves to blame.

یہاں کھانا بھی سادہ تھا۔ کھانا شروع ہوا تو وزیر زراعت ڈاکٹر انور ابراہیم میری میز پر میری کرسی سے ملی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئے۔ کھانے کے دوران گفتگو ہوتی رہی۔ انھوں نے بتایا کہ ملایا میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً پچاس فی صد ہے۔ مگر حکومت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان متحد ہیں جب کہ دوسرے فرقے متحد نہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ یہاں تبلیغی کام ہو رہا ہے یا نہیں۔ انھوں نے کہا کہ بہت کم۔ البتہ دوسرے میدانوں میں کافی ترقیاتی کام ہو رہے ہیں۔

اس کی ایک وجہ غالباً یہ ہے کہ ملیشیا میں برطانیہ کے خلاف آزادی کی جدوجہد زیادہ تر مسلمانوں نے کی۔ چوں کہ انھوں نے نوآبادیاتی دور میں جدوجہد آزادی کی قیادت کی تھی اس لئے دور آزادی میں انھیں غالب سیاسی حیثیت حاصل ہوگئی۔ ہندستان میں بھی مسلمانوں کو اپنی سیاسی تاریخ کی وجہ سے یہ فائدہ مل سکتا تھا۔ مگر تقسیم کی تحریک چلا کر یہاں مسلمانوں نے خود اپنے آپ کو اپنی تاریخ سے کاٹ لیا۔

کوالالمپور کے انٹرنیشنل ہاؤس میں ایک بڑا ہال نماز باجماعت کے لئے خاص کیا گیا تھا۔ یکم اگست کو میں وہاں پہنچا تو میں اکیلا تھا۔ ہال کی لمبی دیواریں پوری کی پوری شیشہ کی تھیں اس لئے باہر کی دنیا بھی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اندر ایک بہت بڑا کمرہ تھا جس کے اندر مکمل سناٹا

تھا۔ باہر کی دنیا میں بھی چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف درخت اور پہاڑ اور بادل اور آسمان دکھائی دے رہے تھے۔

اس طرح کی ایک دنیا میں میں اکیلے ایک انسان کی حیثیت سے کھڑا ہوا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ میرا وجود خدا کے وجود کا ثبوت بن رہا ہے۔ جو لوگ خدا کو نہیں مانتے وہ اسی لئے نہیں مانتے کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس مادی کائنات میں کہیں کوئی زندہ اور باشعور ہستی بھی ہے۔ جو ہم سے الگ اپنا وجود رکھتی ہے۔ انھیں لوگوں کو اس وقت کوئی تعجب نہیں ہوتا جب کائنات کے کسی بعید مقام پر ایک نیا ستارہ دریافت ہو۔ وہ فوراً اس کو مان لیتے ہیں مگر ان کو یہ یقین نہیں آتا کہ یہاں خدا جیسا کوئی زندہ وجود بھی ہے جو کائنات میں کہیں ممکن ہے۔

مگر مذکورہ ہال میں جب میں ایک زندہ وجود کی حیثیت سے تھا اور چیزوں کو دیکھ اور سمجھ رہا تھا، تو اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میں اپنے وجود کی صورت میں خدا کے وجود کو دیکھ رہا ہوں۔ "جیسے میں یہاں ہوں اسی طرح خدا بھی تو ہوگا"۔ میں نے سوچا اگر یہاں ایک زندہ شخص موجود ہے تو کسی دوسرے مقام پر دوسری زندہ اور باشعور ہستی کیوں موجود نہیں ہو سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کو ماننا ایسا ہی ہے جیسے اپنے آپ کو ماننا۔ ایک ماننے اور دوسرے ماننے میں صرف درجہ کا فرق ہے، ان میں نوعیت کا کوئی فرق نہیں۔

سیمنار کی کارروائی ۱۳ جولائی کی دوپہر کو ختم ہوگئی۔ اس کے بعد شہر میں ایک تقریر کا پروگرام تھا کوالالمپور میں ایک ادارہ ہے جس کا نام ہے نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن۔ اس ادارہ کا مقصد مختلف شعبوں میں کام کرنے والے سرکاری افسران کی تربیت کرنا ہے ۱۳ جولائی کی سہ پہر میں یہاں میرا ایک پروگرام تھا۔ طلبہ اور اساتذہ کے سامنے ایک تقریر ہوئی جس میں ان کے سامنے اسلام کا عمومی تعارف کیا گیا۔ یہ تقریر انشاء اللہ انگریزی الرسالہ میں شائع کردی جائے گی۔

کوالالمپور میں اسلامی ایک ادارہ ہے جس کا نام ہے:

Regional Islamic Da'awah Council of Southeast Asia and the Pacific

اس ادارہ کے صدر سابق وزیر اعظم تنکو عبد الرحمن ہیں۔ اور اس کے ڈائرکٹر ایک امریکی نومسلم ہیں جن کا نام حاجی فضل اللہ ولموٹ ہے۔ یہ نہایت ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ آدمی ہیں۔ ولموٹ صاحب کے پاس انگریزی الرسالہ آتا ہے۔ ان سے کوالالمپور میں وزیر اعظم کی رہائش گاہ

پر ملاقات ہوئی۔ انھوں نے گفتگو کے دوران کہا کہ " آپ کا انگریزی الرسالہ ہم کو برابر مل رہا ہے اور بہت پسند ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ مسلم دنیا میں غالباً اتنا اچھا کوئی دوسرا انگریزی رسالہ موجود نہیں "۔

الرسالہ کے انگلش اڈیشن کے بارہ میں اس طرح کے تاثرات مختلف مقامات سے مل رہے ہیں۔ مثلاً سعودی عرب کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص نے لکھا ہے " انگریزی الرسالہ کا ترجمہ بہت شاندار ہوتا ہے۔ مضامین کا انتخاب بھی بے حد موزوں ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس دعوتی تحریک کو کامیابی سے ہم کنار کرے "۔

ایک روز ایک عرب عالم نے ایک شخص سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا انھوں نے ایک کتاب (الاسلام یتحدیٰ) لکھی ہے جس کو ہماری نسل کے ہر نوجوان نے پڑھا ہے۔ (قرأه كل شاب في جيلنا) یہاں سیمنار میں بڑی تعداد میں تعلیم یافتہ عرب آئے تھے۔ وہ سب کے سب میری مذکورہ کتاب پڑھے ہوئے تھے۔ جیسے ہی ان کو معلوم ہوتا کہ الاسلام یتحدیٰ کا مصنف یہاں موجود ہے، وہ بڑے جوش اور محبت کے ساتھ ملتے۔ مگر سب سے زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ ان کو " الاسلام یتحدیٰ " کے بعد میری سرگرمیوں کے بارہ میں صرف یہ معلوم تھا کہ میں ایک بدنام حکمراں سے وابستہ ہوں۔ اس کے سوا انھیں میری سرگرمیوں کے بارہ میں بہت کم واقفیت تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ میں ۱۹۶۷ سے ۱۹۷۴ تک الجمعیۃ ویکلی کے ذریعہ مسلمانوں کی ذہنی تعمیر کا کام کرتا رہا۔ ۱۹۷۶ سے اردو الرسالہ برابر جاری ہے اور ادارہ الرسالہ کے تحت میری کئی درجن اردو کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ " بدنام حکمراں " سے وابستگی کی داستان کا تعلق بھی میری اردو تحریروں سے ہے اور مذکورہ تعمیری اور دعوتی کام بھی اردو میں ہوا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ عرب علماء کو اردو کے ایک جزء کا علم مغالطہ آمیز اضافوں کے ساتھ ہے اور دوسرے بڑے جزء کا انھیں کوئی علم نہیں۔

اس کے ذمہ دار وہ لوگ ہیں جنھوں نے اس خدمت کو انجام دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عرب اردو زبان سے واقف نہیں۔ اس لئے ان کو واقف کرانے والے ہمارے اردو داں دوست ہیں۔ جو مختلف اسباب کے تحت آجکل تمام عرب دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہی حضرات اس صورت حال کے ذمہ دار ہیں۔ اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو میں ہونے والے ۹۹ فی صد کام سے ان کو باخبر نہیں کیا۔ اور اردو کے ایک فی صد جزء کو تحریف اور تغییر کے ساتھ بڑھا

چڑھا کر بتایا۔

وہ لوگ جن کو دوسرے کے اعتراف کے لئے سچے الفاظ نہ ملیں، البتہ اس کو بدنام کرنے کے لئے جھوٹے الفاظ مل جائیں، وہ اپنے عمل سے ثابت کر رہے ہیں کہ وہ اسلام کے اس آخری معیار پر بھی قائم نہیں کہ: من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلیقل خیرا او لیصمت۔

۲ اگست ۱۹۸۴ کو میں نے کوالالمپور چھوڑا۔ اور تھائی ایئرویز کی فلائٹ نمبر ۱۴۶ سے واپس روانہ ہوا۔ بنکاک سے دہلی کا سفر ایئر فرانس کی فلائٹ نمبر ۱۷۵ سے ہوا۔

۲ اگست کی صبح کو جب میں کوالالمپور کے انٹرنیشنل ہاؤس سے نکلا تو میری زبان پر یہ فقرہ تھا: خدایا، جب تک آپ نے چاہا مجھ کو یہاں رکھا اور جب آپ نے چاہا مجھ کو یہاں سے لے جا رہے ہیں۔ اسی طرح دنیا میں جب تک آپ چاہیں گے رکھیں گے اور جب چاہیں گے یہاں سے اٹھا لیں گے۔ خدایا، مجھ کو دنیا میں بھی اپنی رحمتوں کے سایہ میں رکھئے اور آخرت میں بھی اپنی رحمتوں کے سایہ میں جگہ دیجئے۔

کس قدر مشابہت ہے دنیا میں اور آخرت میں، حقیقت یہ ہے کہ اگر آدمی کا احساس زندہ ہو تو دنیا کا ہر واقعہ اس کے لئے آخرت کی یاد دلانے والا بن جائے گا۔

ایر فرانس کے جہاز میں ضروری ہدایات عربی زبان میں بھی لکھی ہوئی نظر آئیں۔ یہ تیل کی قوت کا ایک اعتراف تھا۔ مثلاً بچاؤ سے متعلق ہدایات کے کارڈ پر لکھا ہوا تھا ——— تعلیمات الطواری۔ یعنی حفاظتی ہدایات۔ اسی طرح ایک لفافہ اور ایک ورق فراہم کیا گیا تھا تاکہ مسافر حضرات اس پر اپنے تاثرات لکھیں۔ اس پر عربی زبان میں یہ عبارت درج تھی:

الرجاء تزويدنا بملاحظاتكم على خدمتنا على الارض واثناء السفر وان تدونوا كذلك مقترحاتكم على هذه البطاقة ثم ارسالها بالبريد او تسليمها الى طاقم الطائرة. شكرا.
الخطوط الجوية الفرنسيـــــة.

یعنی آپ سے درخواست ہے کہ زمین پر اور سفر کے دوران ہماری خدمات کے بارہ میں اپنے خیالات اور تجویزیں اس کارڈ پر لکھیں اور پھر اس کو یا تو ڈاک سے ہمیں روانہ کریں یا جہاز کے عملہ کو دستی طور پر دے دیں۔ ایر فرانس کی طرف سے شکریہ۔

انسان صرف اپنے ماحول میں مطمئن رہتا ہے۔ اگر اس کو اس کے ماحول سے الگ کر دیا جائے تو وہ بے چین ہو کر رہ جائے گا۔ کوالالمپور کے دس روزہ قیام میں اگرچہ بظاہر ہر قسم کی سہولتیں تکلفات کے درجہ میں حاصل تھیں۔ مگر اپنے ماحول سے دوری کی بنا پر ایک ایک دن گزارنا مشکل معلوم

ہوتا تھا۔

۲ اگست ۱۹۸۴ کی شام کو جب میں سفر سے واپس ہوکر دہلی پہنچا تو میرا حال اس جانور کا سا ہوا جو پنجرہ میں بند ہوا اور پھر اس کو پنجرہ سے نکال کر دوبارہ اس کے طبعی ماحول (Habitat) میں پہنچا دیا جائے۔ میں نے سوچا ـــــ کو الاپور سے دہلی واپس آنے کے لئے میرے پاس ریٹرن ٹکٹ موجود تھا، اس لئے بآسانی میں اپنے وطن واپس آگیا۔ مگر موت کے بعد آدمی کا کیا حال ہوگا۔ کیوں کہ موت کا سفر ایک ایسا سفر ہے جس میں آدمی کے پاس واپسی کا ٹکٹ نہیں ہوتا۔

آہ، کیسا عجیب دن انسان کے اوپر آنے والا ہے مگر اس کے باوجود وہ کتنا زیادہ اس سے غافل پڑا ہوا ہے۔

خبرنامہ اسلامی مرکز

۱۔ جولائی ۱۹۸۴ میں کوالالمپور (ملیشیا) میں اسلامائزیشن آف نالج کے عنوان پر ایک انٹرنیشنل سیمنار ہوا۔ مارچ ۱۹۸۴ میں مولانا وحیدالدین خاں صاحب ایک سفر کے دوران ریاض میں تھے وہاں مذکورہ سیمنار کے دو ذمہ دار (دکتور احمد توتونجی اور دکتور طٰہٰ جابر العلوانی) مولانا موصوف سے ملے اور کوالالمپور کے سیمنار میں شرکت کی خصوصی دعوت دی۔ اس کے بعد اس کے واشنگٹن کے دفتر سے باقاعدہ دعوت نامہ موصول ہوا۔ اس کے بعد مولانا موصوف مذکورہ سیمنار میں شریک ہوئے۔ اس سفر کی مفصل روداد علیٰحدہ مضمون میں شائع کی جا رہی ہے۔ اس موقع پر مولانا موصوف نے ایک مقالہ (انگریزی زبان میں) پیش کیا۔ یہ مقالہ (اردو میں) الرسالہ نومبر ۱۹۸۴ میں شائع ہو چکا ہے۔ اس سیمنار کی میزبانی کے فرائض حکومت ملیشیا نے انجام دئے۔ اس سلسلہ میں حکومت ملیشیا کی طرف سے مولانا موصوف کے نام جو خط موصول ہوا ہے اس کی نقل مقابل کے صفحہ پر دی جا رہی ہے۔ اس سیمنار کی خاص اہمیت یہ ہے کہ یہ "سیاست سے واپسی" کی ایک علامت ہے۔ مسلم ملکوں کے نوجوان جو اس سے پہلے سیاسی ٹکراؤ کو دینی کام سمجھتے تھے اب وہ سنجیدگی کے ساتھ یہ سوچنے لگے ہیں کہ سب سے پہلا ضروری کام فکری انقلاب ہے۔ اس کے بعد ہی کسی دوسرے انقلاب کی طرف سفر شروع کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ اسلامی مرکز کے مشن سے وابستہ افراد نے بعض مقام پر ایک خاص دعوتی پروگرام شروع کیا ہے۔ اس کو وہ "لاؤڈ اسپیکر پروگرام" کہتے ہیں۔ یہ پروگرام وہ زیادہ تر مسجد میں کرتے ہیں۔ الرسالہ یا کسی کتاب سے مناسب مضمون کا انتخاب کر لیا جاتا ہے۔ اور اس کو لاؤڈ اسپیکر پر پڑھ کر سنایا جاتا ہے۔ یہ کام خاص طور پر آغاز سحر کے وقت کیا جاتا ہے جب کہ ہر طرف سناٹا ہوتا ہے اور پڑھنے والے کی آواز دور دور تک سنائی دیتی ہے۔ یہ پروگرام خدا کے فضل سے مفید ثابت ہو رہا ہے۔ اس کو دوسرے مقامات پر بھی حسب حالات شروع کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۴ کو اسلامی مرکز میں نکاح کی ایک تقریب ہوئی۔ یہ ثانی اثنین خاں (ذیبحہ الرسالہ) کے نکاح کی تقریب تھی۔ تقریب بالکل سادہ طور پر انجام پائی۔ کسی بھی قسم کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا۔ فوری طور پر کچھ قریبی لوگوں کو بلا کر بس نکاح پڑھا دیا گیا۔ لوگ اس اسلامی سادگی کو دیکھ کر بے حد متاثر ہوئے۔ حاضرین میں سے بعض لوگ اسی وقت الرسالہ کے خریدار بن گئے جو کہ اس سے پہلے اس کے خریدار نہیں تھے۔



MINISTER OF AGRICULTURE MALAYSIA.

MP: 1407 (S)/87

12 th September, 1984

16 Zulhijjah 1404

Prof. Wahiduddin Khan,
C-29, Nizamuddin West,
New Delhi, 110013,
INDIA.

Prof. Wahiduddin, السلام عليكم

THIRD INTERNATIONAL SEMINAR ON ISLAMIC THOUGHT HELD ON 26 - 31ST JULY, 1984 IN KUALA LUMPUR

I take this opportunity to convey my appreciation for your kind presence and participation at the above-mentioned seminar.

It is very rare that we have such a gathering of eminent Islamic scholars from various parts of the world discussing the many issues facing the ummah today.

The papers were very well presented and ably discussed. The proceedings of the seminar have been recorded and would serve as an invaluable source of reference for all concerned.

Praise be to Allah that Malaysia was given the opportunity to host such an auspicious seminar.

I sincerely hope that the excellent cooperation and contribution given by you would continue and be strengthened further.

جزاك الله خيرا
والسلام عليكم ورحمة الله

(Anwar Ibrahim)

WISMA TANI, JALAN MAHAMERU, KUALA LUMPUR.
Telefon : 982011, 986679.
Telex : TANIAN MA 33045

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔

الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارنبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم ازکم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لئے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینے میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپواکر دفتر الرسالہ سی۔۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

'Introduction to Islam' Series

1. The Way to Find God
2. The Teachings of Islam
3. The Good Life
4. The Garden of Paradise
5. The Fire of Hell

The series provides the general public with an accurate and comprehensive picture of Islam—the true religion of submission to God. The first pamphlet shows that the true path is the path that God has revealed to man through His prophets. The second pamphlet is an introduction to various aspects of the Islamic life under forty-five separate headings. Qur'anic teachings have been summarized in the third pamphlet in words taken from the Qur'an itself. In the fourth pamphlet the life that makes man worthy of Paradise has been described and in the last pamphlet the life that will condemn him to Hell-fire.

Price per set: Rs 24.00

Regd. No. D(SE) 243
Regd. R.N. No. 28822/76

December 1984
Issue No 97

AL-RISALA MONTHLY

C-29 NIZAMUDDIN WEST NEW DELHI 110 013 Tel. 611128

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن جلد اوّل	50/-
الاسلام	20/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-
ظہور اسلام	25/-
احیاء اسلام	15/-
پیغمبر انقلاب	25/-
دین کیا ہے	2/-
قرآن کا مطلوب انسان	5/-
تجدید دین	3/-
اسلام دین فطرت	3/-
تعمیر ملت	3/-
تاریخ کا سبق	3/-
مذہب اور سائنس	5/-
عقلیات اسلام	3/-
فسادات کا مسئلہ	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-
تعارف اسلام	3/-
اسلام پندرھویں صدی میں	2/-
راہیں بند نہیں	3/-
ایمانی طاقت	3/-
اتحاد ملت	3/-
سبق آموز واقعات	3/-
زلزلۂ قیامت	4/-
حقیقت کی تلاش	3/-
پیغمبر اسلام	3/-
آخری سفر	3/-
حقیقت حج	2/-
اسلامی دعوت	3/-
خدا اور انسان	3/-

تعارفی سٹ

سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	3/-
حیات طیبہ	3/-
باغ جنت	3/-
نار جہنم	3/-

English Publications

The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Mohammad: The Ideal Character	3/-

مکتبہ الرسالہ سی - ۲۹ ، نظام الدین ویسٹ ، نئی دہلی ۱۳